ستمبر 2013، قیمت -/10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

یوم اساتذہ مبارک

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi
جلد:1 شمارہ:4 ستمبر 2013

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
یوم اساتذہ	ٹیچر کی نصیحت	ساحرلدھیانوی	3
	ایک دن اساتذہ کے نام	سہیل انجم	4
	کالج کے مینار	نصرت ظہیر	6
دنیا کے مذھب	زرتشتیت	نصرت ظہیر	9
کھانی	عجیب کھلونا	عبدالصمد	12
نظم	شکوے شکایت	اسنیٰ بدر	15
کھانیاں	ماں	شکیل جاوید	16
	چھناکے	حبیب ریتھ پوری	18
	چالاک مصور	سمیع الدین خاں شاداب	22
نظم	کہانی سناؤ	حیدر بیابانی	26
کامکس کھانیاں	پھونک	نورشاہ	27
	ماں کے آنسو	نورشاہ	29
نظمیں	شطرنج کے مہرے	یوسف انصاری	33
	کمپیوٹر	مجیب شہزر	34
نانی کا صندوق	چکنی ہانڈی	عابدہ محبوب	35
	کھل کر ہنسیے	لطیفے	38
	ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے	نامعلوم	39
دونظمیں	صبح سویرے	جسپال کور	40
	ترنگا	راشد حسین راہی	40
اس ماہ کی باتیں	ستمبر	ادارہ	41
آپ کے سوال	ڈاکٹر بقراط کے جواب	ادارہ	46
قسط وار ناول	اسّی دن کا سفر 4	جولزورنے	49
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	55
کھیل کھلاڑی	بیڈمنٹن	شبنم پروین	57
ڈاک خانہ	بڑوں کی باتیں	خطوط	60
دماغی ورزش	ذہنی آزمائش	ادارہ	62
آپ کی باتیں	اردو فیس بک	بچوں کے پیغام	63

سرورق: ایک قدیم مغل پینٹنگ میں اساتذہ شاگردوں کو خطاطی یعنی کیلیگرافی سکھاتے ہوئے

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت 'بچوں کی دنیا': 49539011
خریداری کے لیے: 49539000، ایکسٹنشن: 112

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد- 500002
فون: 040 - 24415194

آپس کی باتیں!

اس مہینے کی شروعات ہم ان بڑی شخصیتوں کے احترام اور عقیدت کے اظہار سے کیا کرتے ہیں، جنھوں نے ہماری شخصیت کو بنانے سنوارنے اور سجانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ میری مراد ہے اُن اساتذۂ کرام سے جو ہمیں ملک کا مفید شہری بناتے ہیں اور جن کا ہماری ذہنی پرورش میں ہمارے والدین سے بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ پانچ دسمبر کا دن وطنِ عزیز کے ایک مشہور تعلیم داں فلسفی اور ملک کے دوسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا یومِ پیدائش ہی نہیں ہے، بلکہ ان لاکھوں استادوں اور استانیوں کی مہربانیوں کو یاد کرنے اور ان کا شکر بجالانے کا بھی موقع ہے جن کی یادیں ہمارے ذہن کی تختی پر ہمیشہ نقش رہتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا بچّو کہ آدمی چاہے جتنا بڑا ہو جائے، اور اس کا منصب یا عہدہ چاہے جتنا بھی اونچا کیوں نہ ہو، ٹیچر سامنے آجائیں تو وہ انھیں دیکھتے ہی بے ساختہ احترام سے کھڑا ہو جاتا ہے اور عقیدت سے سر جھکا لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماں باپ سے ہمارا خون کا رشتہ ہوتا ہے، اور اس رشتے کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ لیکن جو اعلیٰ درجہ استاد اور شاگرد کے رشتے کو حاصل ہے اس کی برابری کوئی نہیں کرسکتا۔ زندگی کے ہر قدم پر یہ رشتہ ہمارے کام آتا ہے اور استاد کی رہنمائی ہمیں کامیابی کی منزلوں تک پہنچاتی ہے۔ مسئلوں اور پریشانیوں کو ٹھیک طرح سمجھ کر کیسے ان کا حل نکالا جائے، قوم سماج اور ملک کی ترقی کے لیے ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں، کس طرح ہم اپنے شہر، اپنے صوبے اپنے ملک اور کل ملا کر پوری دنیا کو بہتر بنا سکتے ہیں، کیا صحیح ہے کیا غلط ہے، کس راستے پر تباہی ہے اور کس راستے میں سب کا بھلا ہے۔ یہ سب ہمارے استاد ہی ہمیں بتاتے ہیں۔ استاد نہ ہوتے تو نہ دنیا میں تعلیم پھیلتی، نہ علم پھلتا پھولتا نہ سماج نے ترقی کی ہوتی۔ انسان بس پیدا ہوتا، کھاتا پیتا، زندہ رہتا اور مر جایا کرتا۔ آدمی اور باقی جانداروں میں کوئی فرق ہی نہ ہوتا۔ یہ صرف اساتذۂ کرام ہیں جو آدمی کو انسان بناتے ہیں۔ پھر چاہے وہ جس جماعت یا کلاس کے استاد ہوں۔ خواہ انھوں نے آپ کو الف بے تے اور اے بی سی ڈی پڑھا کر حرف پہچاننا اور لفظ بنانا سکھایا ہو، چاہے حساب اور جیومیٹری کی گتھیاں سلجھائی ہوں، یا پھر ہمارے ہر طرف پھیلی ہوئی اس عظیم الشان کائنات کے گہرے راز سمجھنے میں ہماری مدد کی ہو، وہ بہر حال ہمارے استاد ہیں اور ان کی عظمت کو کم یا زیادہ کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔ وہ سبھی ہمارے لیے عظیم اور لائقِ احترام ہیں۔

تو بھئی جس طرح اس مہینے کی شروعات اساتذۂ کرام کے احترام سے ہوتی ہے، اسی طرح 'بچوں کی دنیا' کے اس شمارے کا آغاز بھی ہم یوم اساتذہ سے کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ 'بچوں کی دنیا' نے بہت جلد، نہ صرف بچّوں کے بلکہ بڑوں کے دلوں میں بھی ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ آپ کے اور بزرگوں کے ہر روز ملنے والے خط اس کا ثبوت ہیں۔ دور دراز مقامات سے بھی 'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے ہمیں روزانہ مسلسل فون آرہے ہیں اور رسالے کی مقبولیت کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہم آپ سبھی کے شکر گزار ہیں۔ اپنا خیال رکھیے۔ خوب محنت سے، جی لگا کر پڑھیے۔ والدین کی طرح اپنے اساتذہ کی بھی عزت کیجیے اور ان کی دعائیں لے کر اپنی زندگی کو کامیاب بنائیے۔ آپ کا،

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

یوم اساتذہ پر

□ ساحر لدھیانوی

ٹیچر کی نصیحت

بھارت ماں کی آنکھ کے تارو
ننھے منے راج دلارو
جیسے میں نے تم کو سنوارا
ایسے ہی تم دیش سنوارو

یہ جو ہے اک چھوٹا سا بستہ
علم کے پھولوں کا گل دستہ
کرشن ہیں اس میں رام ہیں اس میں
بدھ مت اور اسلام ہیں اس میں
یہ بستہ عیسیٰ کی کہانی
یہ بستہ نانک کی بانی
اس میں چھپی ہے ہر سچائی
اپنا سکھ اوروں کی بھلائی
اس بستے کو سیس نواؤ
اس بستے پر تن من وارو
بھارت ماں کی آنکھ کے تارو

چھوڑ کے جھوٹی ذاتیں پاتیں
سب سے سیکھو اچھی باتیں
اپنا کسی سے بیر نہ سمجھو
جگ میں کسی کو غیر نہ سمجھو
آپ پڑھو اوروں کو پڑھاؤ
گھر گھر گیان کی جوت جگاؤ
نوجیون کی آس تمھیں ہو
بنتا ہوا اتہاس تمھیں ہو
جتنا گہرا اندھیارا ہو
اُتنے اونچے دیپ ابھارو
بھارت ماں کی آنکھ کے تارو

یہ سنسار جو ہم نے سجایا
یہ سنسار جو تم نے پایا
اس سنسار میں جھوٹ بہت ہے
ظلم بہت ہے لوٹ بہت ہے
ظلم کے آگے سر نہ جھکانا
ہر اک جھوٹ سے ٹکرا جانا
اس سنسار کا رنگ بدلنا
اونچ اور نیچ کا ڈھنگ بدلنا
سارا جگ ہے دیش تمہارا
سارے جگ کا روپ نکھارو
بھارت ماں کی آنکھ کے تارو

سہیل انجم

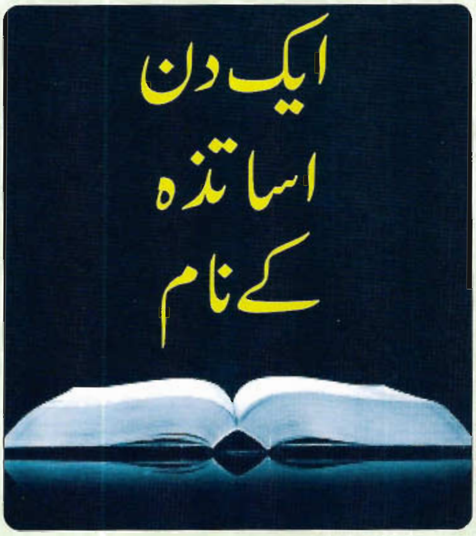

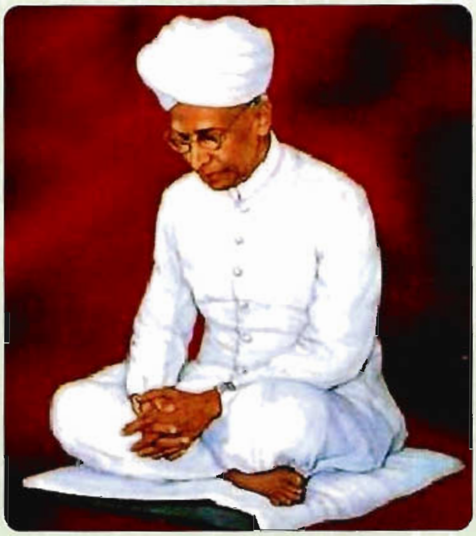

پیارے دوستو ہمارے اساتذہ کا ہمیں پڑھنا لکھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک اچھا انسان بنانے میں کتنا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور ان کا مقام کتنا اونچا ہے یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ دنیا کے اور بہت سے ملکوں میں بھی ٹیچروں کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے لیے ان کے احترام میں ایک دن ضرور منایا جاتا ہے۔ افغانستان میں 15 اکتوبر کو، بنگلہ دیش میں 4 اکتوبر کو، برطانیہ اور پاکستان میں 5 اکتوبر کو ٹیچرز ڈے ہوتا۔ امریکہ میں تو مئی کا پہلا ہفتہ پورے کا پورا ٹیچروں کے نام رہتا ہے اور اس میں جو منگل آتا ہے اسے وہاں اساتذہ کے قومی دن کے طور پر منانے کا رواج ہے۔

ہندوستان میں پانچ ستمبر کو یوم اساتذہ یا ٹیچرس ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کی شروعات 1962 میں ہوئی تھی۔ دراصل یہ دن ہندوستان کے پہلے نائب صدر اور دوسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کا یوم پیدائش ہے۔ وہ 1888 میں اسی تاریخ کو مدراس (موجودہ چینئی) سے 48 کلومیٹر دور ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ رادھا کرشنن ایک عظیم استاد اور فلسفی تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ کیمبرج لندن میں بھی تعلیم پائی تھی۔ 1909 سے لے کر 1947 تک، جب ملک آزاد ہوا، انھوں نے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ بعد میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے کہنے پر انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا بھی عہدہ سنبھالا۔ آزادی ملنے کے بعد وہ یونیسکو UNESCO میں ہندوستان کے نمائندے رہے اور پھر سوویت یونین میں ہندوستان کے سفیر بھی بنے۔ وہ ہندوستان کا آئین تیار کرنے والی اسمبلی کے ممبر بھی چنے گئے تھے۔ انھیں 1952 میں پہلی بار ملک کا نائب صدر اور 1962 میں صدر منتخب کیا گیا۔ انھیں تعلیم کے میدان میں قابل ذکر کام کرنے کی وجہ سے کئی ایوارڈ حاصل ہوئے۔ آزادی سے پہلے انھیں شہنشاہ برطانیہ کی حکومت نے 'سر' کا خطاب دیا لیکن آزادی ملنے کے

بعد انھوں نے اس خطاب کا استعمال بند کر دیا۔

یہ واقعہ بھی دل چسپ ہے کہ ان کے یوم پیدائش کو ٹیچرس ڈے کے طور پر کیوں منایا جاتا ہے۔ اُن کے شاگرداُن سے بہت پیار اور ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ جب وہ 1962 میں ملک کے صدر ہوئے تو ایک روز کچھ شاگرداُن سے ملنے گئے اور کہا کہ وہ ہر سال پانچ ستمبر کو ان کا یوم پیدائش منانا چاہتے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اس کے بجائے کہ تم لوگ بار بار میرا یوم پیدائش مناؤ، کیوں نہیں ایسا کرتے کہ اس تاریخ کو یوم اساتذہ کے طور پر مناؤ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ بس پھر کیا تھا اس کے بعد اس دن کو یوم اساتذہ کے طور پر منایا جانے لگا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن استاد یعنی ٹیچر کو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ سماج کے لیے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کے بہترین دماغ والوں کو ہی استاد بننا چاہیے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک استاد کی کیا قدر اور اہمیت تھی۔ ویسے استاد کی اہمیت تو ہمیشہ رہی ہے۔ ایک ہندی شاعر نے کہا ہے کہ اگر خدا اور استاد دونوں میرے سامنے ہوں تو میں استاد کے قدم چوم لوں گا کیونکہ یہ استاد ہی ہیں جنھوں نے مجھے خدا کے بارے میں بتایا اور ان سے ملایا ہے۔ اس کے علاوہ شاگرد کو استاد کی معنوی اولاد کہا جاتا ہے یعنی شاگرد استاد کے لیے ان کے بچوں جیسے ہوتے ہیں۔ یوم اساتذہ صرف طلبہ اور استادوں کے لیے ہی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ سماج کے تمام لوگوں کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے۔ استاد ہی ہیں جو تعلیم دے کر بچوں کو ذمہ دار شہری بناتے ہیں اور ان کے اندر بہترین انسان کی خوبیاں پیدا کرتے ہیں۔ گویا وہ ایک مہذب اور انسانیت کی قدر کرنے والے اور انسانیت کو فروغ دینے والے سماج کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن بڑے ہی قابل اور عالم شخص تھے۔ ان کی ایم اے کی تھیسس اس وقت چھپنے کے لیے چلی گئی تھی جب وہ صرف 20 سال کے تھے۔ شروع کے دنوں میں انھیں بڑی غریبی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ایک ٹیچر تھے لیکن اتنی رقم بھی ان کے پاس نہیں ہوتی تھی کہ وہ کھانے کے لیے برتن خرید سکتے۔ دو وقت کا کھانا وہ کیلے کے پتّوں پر کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کے کیلے کے پتّے خریدنے کو بھی ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس لیے انھوں گھر کا فرش صاف کیا اور اسی پر رکھ کر کھانا کھایا۔ اس وقت ان کی تنخواہ صرف 17 روپے تھی اور کنبہ خاصا بڑا تھا جس میں میاں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ انھوں نے قرض لیا لیکن اس کا سود بھی ادا نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ گھر چلانے کے لیے انھیں اپنے میڈل بیچنے پڑے۔

عظیم فلسفی رادھا کرشنن اور عظیم گلوکار محمد رفیع ایک ساتھ

اپنے شاگردوں میں وہ بے حد مقبول تھے۔ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ آخر قابلیت، محنت اور لگن نے ہی انھیں ملک کے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچایا۔

سچ تو یہ ہے کہ آزادی سے پہلے اساتذہ کی زندگی بہت مشکل ہوا کرتی تھی اور ان میں اکثر غربت میں زندگی گزارتے تھے۔ آزادی کے بعد ہمارے ٹیچروں کے حالات بہتر ہونا شروع ہوئے، اور آج شکر ہے ہمارے اساتذہ اتنا تو کما ہی لیتے ہیں کہ اپنے کھانے کے برتن خرید سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے بہت سے شاگرد اپنے اساتذہ کا اتنا احترام نہیں کرتے جتنا پہلے کے لوگ کرتے تھے۔ ہمیں امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ آپ ان میں سے نہیں ہیں۔ □

◆ سہیل انجم 370 /6A۔ ذاکر نگر نئی دہلی۔110025

کالج کے مینار

یوم اساتذہ پر

□ نصرت ظہیر

جب کبھی ان اساتذہ کا خیال آتا ہے جن کی بدولت ہم جیسے بے علم، دولت علم سے مالا مال ہوئے تو سب سے پہلا نام یاد آتا ہے مولوی یٰسین کا۔ آج تیس برس کے بعد ان کا تصور کرتے ہیں تو عقیدت اور خوف کے مارے کپکپی چڑھ جاتی ہے۔

مولوی یاسین ہلالی۔ پچپن ساٹھ کا سن، دبلا پتلا جسم، سانولا رنگ، کثرت پان نوشی سے سیاہ پڑے ہوئے دانت، بدن پر میل سے چکٹ اور پان کی پیک سے گلزار بنا ہوا کرتا پاجامہ، پیروں میں سلیم شاہی جوتی، سر پر کبھی ململ کی ٹوپی تو کبھی سر سے دوگنے وزن اور حجم کی پگڑی اور یہ سب کچھ جوڑ جاڑ کے بمشکل چار فٹ کا قد اور کلوگرام میں عمر سے آدھا وزن! یہ تھے اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور کے اردو ٹیچر مولوی یاسین۔ دیکھنے میں انتہائی مختصر، کمزور اور معمولی انسان نظر آتے تھے مگر ہیبت کا یہ عالم تھا کہ جب کلاس لینے کے لیے ٹیچرز روم سے باہر نکلتے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی۔ بچے اپنی کلاسوں میں چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ امرود اور جامن کے درختوں پر چہچہانے والی چڑیاں بھی گھونسلوں میں دبک کر خاموش ہو جاتی تھیں۔ پتہ نہیں انھیں کیسے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ مولوی یاسین ٹیچرز روم سے باہر نکل چکے ہیں۔

مولوی یاسین اردو پڑھاتے تھے اور صحیح معنوں میں اردو کے ٹیچر تھے۔ صحیح معنوں میں اس لیے کہ ان کا سبق کبھی اردو گرامر سے آگے نہیں بڑھا۔ اپنے پیریڈ میں نہ کبھی انھوں نے غالب اور اقبال کا ذکر کیا، نہ آتش و ناسخ کو تکلیف دی، یہاں تک کہ میر انیس اور مرزا دبیر میں بھی مقابلہ نہیں کرایا۔ ان کے تو بس دو ہی کیریکٹر تھے حامد اور محمود، چنانچہ ان کا پورا پیریڈ اسی بحث میں ختم ہو جاتا تھا کہ حامد اسکول کیوں جاتا ہے اور محمود اسکول کیوں نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک دوست شاہ محمود نے ان کی کلاس کبھی اٹینڈ نہیں کی۔

لیکن گرامر بھی مولوی یاسین تبھی پڑھاتے تھے، جب ان کے منہ میں پان نہ ہو اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ جس طرح چین اسموکر ایک سگریٹ کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس سے دوسری سگریٹ سلگا لیتا ہے، اسی طرح وہ ایک پان کی پیک ختم ہونے سے پہلے منہ میں دوسرا پان رکھ لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار کسی وجہ سے یہ تار ٹوٹ جاتا تو درمیانی وقفہ میں اردو کی گرامر پڑھا دیتے تھے۔ پان وہ اس قدر کھاتے تھے کہ ہم نے انھیں پان کے سوا کبھی کچھ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سنا ہے صبح کی چائے ضرور پیتے تھے لیکن اس کے بعد ناشتہ ہو یا لنچ، یا پھر ڈنر، سب پان پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔

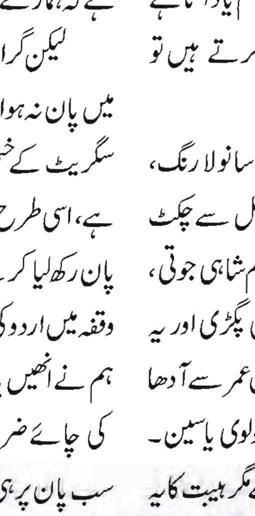

یہ بھی سنا ہے کہ بازار نخاسہ میں جہاں وہ رہتے تھے، ہمیشہ ایک خاص پنواڑی سے پان بندھواتے تھے اور ہمیشہ اس کے مقروض رہتے تھے، لیکن غیرت مند اور وضع دار ایسے تھے کہ جب بھی تنخواہ ملتی تو ساری تنخواہ پابندی سے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی پنواڑی انھیں چھیڑنے کے لیے کہہ دیتا۔

''مولوی صاحب! آپ تو خواہ مخواہ کالج جاتے ہیں، جب ساری تنخواہ مجھی کو دینی ہے تو مجھے حکم دیجیے میں کلاس میں پڑھا آیا کروں گا۔ آپ یہاں بیٹھ کر پان لگاتے رہیے اور کھاتے رہیے۔''

اس پر مولوی یاسین اسے ایک آنکھ سے گھور کر دیکھتے (دوسری کسی حادثے کی نذر ہوگئی تھی) اور اگر منہ میں پان نہ ہوتو عربی یا فارسی میں ایسی وزنی گالی دیتے کہ پنواڑی کی روح تک کانپ اٹھتی۔ اردو میں گالی دینا وہ سب سے بڑی بدتمیزی سمجھتے تھے ''خبیث الدہر'' ان کی محبوب گالی تھی۔ اگر کسی پر زیادہ ہی غصہ آتا تھا تو اسے ''خبیث الدہر کا بچہ'' کہہ دیتے تھے، لیکن تب، جب منہ میں پان نہ ہو۔ ایک مرتبہ وہ بے احتیاط ہوگئے جس کی وجہ سے کئی لڑکے فیل ہوتے ہوتے بچے۔

لیکن اس واقعہ کے بیان سے پہلے یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ ہر چند مولوی صاحب کو لوگ مولوی صاحب ہی کہتے تھے مگر مولوی والی کوئی بات ان کی زندگی میں نظر نہیں آتی تھی، سوائے اس کے کہ وہ اعلا درجے کے عالم تھے۔ نہ کبھی کسی نے انھیں نماز پڑھتے دیکھا نہ روزہ رکھتے سنا۔ البتہ کالج میں وہ نماز کے پورے پابند رہا کرتے تھے۔ جب بھی دینیات کے استاد قاری ظہور احمد خاموش، لڑکوں کو نماز سکھانے کے لیے کالج کی خوبصورت مسجد میں لے جاتے تو کچھ دیر بعد مولوی یاسین بھی چپکے سے وہاں پہنچ جاتے۔ اس کے بعد قاری خاموش تو بہ آواز بلند نماز پڑھا رہے ہوتے اور مولوی صاحب صفوں کے بیچ خراماں خراماں چلتے ہوئے نمازیوں کا معائنہ بالکل اسی انداز میں کرنے لگتے جس طرح کسی ملک کا حکمراں دوسرے ملک میں جانے پر گارڈ آف آنرز دیے جانے کے وقت فوجی دستے کا معائنہ کرتا ہے۔

اس وقت کسی لڑکے کی ٹوپی ذرا بھی آڑی ترچھی نظر آتی یا کوئی لڑکا ناک کان کھجاتا نظر آتا تو پیچھے سے مولوی یاسین کے ہاتھ کا زوردار طمانچہ اس کی گردن پر پڑتا اور بے خبر لڑکے کو پورا یقین ہو جاتا کہ واقعی اللہ سب کچھ دیکھتا ہے۔

اسی طرح مولوی صاحب روزوں کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ رمضان کے دنوں میں انھیں پان کھاتے اور چباتے نہیں دیکھا گیا۔ البتہ یہ عجیب بات تھی کہ جیسے ہی روزے شروع ہوتے، انھیں کچھ نزلہ زکام سا ہو جاتا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ناک اور منہ صاف کرتے تھے۔ اس کا بھی ان کا الگ انداز ہوتا تھا۔ ہر بار ان کا دایاں ہاتھ کرتے کی جیب سے نکل کر داڑھی کی طرف سے منہ اور ناک کے اوپر ہوتا اور پیشانی تک جاتا، اور پھر بائیں ہاتھ کے رومال سے دایاں ہاتھ پونچھ کر اپنی واحد آنکھ سے پوری کلاس کو گھورنے لگتے۔ یہ بات بہت بعد میں جا کر معلوم ہوئی کہ منہ صاف کرتے وقت ان کا دایاں ہاتھ خالی نہیں ہوتا تھا۔ ہتھیلی میں ایک عدد پان چھپا رہتا تھا جسے وہ رمضان کے احترام میں سب سے چھپا کر ناک صاف کرنے کے بہانے منہ میں رکھ لیتے تھے۔

ایک مرتبہ عین رمضان میں وقت امتحان آگیا۔ مولوی صاحب جس کلاس روم میں نگرانی پر مامور ہوئے وہ کافی لمبا تھا۔ اس کلاس میں مولوی صاحب سامنے کے بجائے ہمیشہ پیچھے بیٹھتے اور لڑکوں کو ڈرانے کے لیے ہر آدھے گھنٹے بعد بہ آواز یہ اعلان کرتے رہتے۔ ''خبردار! مولوی یاسین سب کچھ دیکھ رہا ہے اس لیے کوئی کچھ نہ دیکھے اور نقل کی کوشش نہ کرے۔'' اب کس کی مجال تھی کہ کوئی پلٹ کر دیکھتا۔ سب مارے خوف کے امتحان دیتے رہتے۔

لیکن ایک دن کیا ہوا کہ پیچھے بیٹھے

ہوئے ایک لڑکے کی نظر اپنے پیچھے اس ڈیسک کی طرف اٹھ گئی جس پر امتحان دے کر فارغ ہونے والے لڑکے اپنی کاپیاں رکھ کر جاتے تھے اور جس کے پیچھے مولوی یاسین بیٹھے رہتے تھے۔ امتحان کا وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ لڑکے نے دیکھا کہ مولوی صاحب نے جیب سے پان کا بٹوا نکالا اور چار پانچ پان ایک ساتھ منہ میں رکھ لیے۔ اس کے بعد جیسے ہی انھوں نے منہ بند کیا ان کی نظر لڑکے کی طرف اٹھ گئی۔ اب جو دونوں کی آنکھیں تین ہوئیں تو مولوی صاحب کا چلتا ہوا منہ رک گیا۔ چند لمحے وہ لڑکے کو گھورتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس اس زور سے ''خبیث الدہر'' کہا کہ لڑکا تو خوف سے اچھل کر دور جا پڑا اور ''دہر'' کے جھٹکے میں پان کے ٹکڑے ان کے منہ سے نکل کر ڈیسک پر رکھی ہوئی کاپیوں پر بکھر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی کاپیاں خراب ہوگئیں اور جن کی وہ کاپیاں تھیں وہ بڑی مشکل سے فیل ہوتے ہوتے بچے۔

مولوی صاحب میں ایک وصف اور تھا وہ دائیں بائیں دونوں ہاتھوں سے ایک جیسے انداز میں لکھ سکتے تھے۔ کلاس میں آتے ہی ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ بلیک بورڈ پر دائیں ہاتھ سے آدھا جملہ لکھ کر بائیں ہاتھ سے اسے پورا کرتے اور پھر لڑکوں سے پوچھتے۔ ''اے احمقو! کیا تم نے کسی اور کو یوں کو دونوں ہاتھوں سے ایک جیسا لکھتے ہوئے دیکھا ہے؟''

پوری کلاس بہ یک آواز ''نہیں'' کہہ کر جواب دیتی جس سے خوش ہوکر وہ دو تین پان ایک ساتھ منہ میں رکھ لیتے اور تین چار لڑکوں کو دروازے کے قریب مرغا بنا کر آرام سے کرسی پر بیٹھے جگالی کرتے رہتے۔ لڑکوں کو مرغا اس لیے بنایا جاتا تھا کہ اگر پرنسپل صاحب معائنے کے لیے نکلیں تو باہر سے ہی سمجھ جائیں کلاس چل رہی ہے۔

اس کے باوجود مولوی صاحب کا ریکارڈ سب سے اچھا رہتا تھا۔ ان کی کلاس کا ہر لڑکا اور چاہے جتنے مضامین میں فیل ہو مگر اردو میں ہمیشہ پاس آتا تھا۔ ایسا سو فیصد رزلٹ کالج میں اور کسی مضمون میں نہیں آتا تھا اور ان کی کلاس کے سو میں سے سو لڑکے اردو میں پاس ہوجاتے تھے۔

بلکہ ایک مرتبہ تو یہ ہوا کہ رزلٹ سو فیصد سے بھی آگے بڑھ گیا اور کلاس کے کل چالیس لڑکوں میں سے پینتالیس پاس ہوگئے۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ جانچ پڑتال ہوئی تو پتہ چلا کہ زائد لڑکوں کے سیکشن بدل گئے تھے اور وہ بہ یک وقت دو دو کلاسوں میں پاس آئے تھے کیونکہ مولوی صاحب کے رجسٹر میں ان کے نام دونوں طرف درج تھے۔

کئی بار پرنسپل صاحب انھیں تاکید کرتے کہ مولوی صاحب کم سے کم دو چار لڑکے تو فیل کر دیا کیجئے۔ ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا۔ ''جب تک مولوی یاسین زندہ ہے اس کے قلم سے کوئی لڑکا فیل نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو شک ہے کہ میں نے کسی کو جان بوجھ کر پاس کیا ہے تو کاپیاں دوبارہ جانچ لیجئے۔'' اور واقعی جب کاپیاں دوبارہ جانچی جاتیں تو پتہ چلتا کہ مولوی صاحب نے کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔

پھر ایک دن سب نے سنا مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔

اس روز پورا کالج سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر نگاہ چھوٹے سے قد کے اس آدمی کو ڈھونڈ رہی تھی جس کے بغیر کالج کا تصور ہی مشکل تھا۔ تمام لڑکے پلے گراؤنڈ میں اداس بیٹھے تھے۔ کئی لڑکے، جن سے مولوی صاحب کو خاص محبت تھی اور اکثر ان ہی کو مرغا بنایا کرتے تھے، چپ چاپ رو رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں تک کہ امرود اور جامن کے درختوں پر چڑیوں کا شور بھی تھم گیا تھا۔

اس واقعہ کو تیس برس سے اوپر ہوئے مگر آج بھی جب عید کی نماز کے لیے عیدگاہ جاتے وقت اسلامیہ کالج کے سامنے سے گزر ہوتا ہے تو کالج کے مینار دیکھ کر مولوی یاسین یاد آجاتے ہیں اور سر احترام سے جھک جاتا ہے کہ وہ بھی کالج کے ایک مینار ہی تو تھے۔ □

نصرت ظہیر

زرتشتیت

ھماری دنیا میں بہت سے مذہب ھیں جنھوں نے کئی طرح سے دنیا پر اور اس میں رھنے والوں پر اپنا اثر ڈالا ھے۔اس دنیا کو اچھی طرح جاننے اور اس کے الگ الگ علاقوں کی تاریخ اور تہذیب کو سمجھنے کے لیے مذہبوں کو جاننا بہت ضروری ھے۔ بڑے ھو کر آپ کو کالج اور یونی ورسٹیوں میں مذہبوں کے بارے میں زیادہ جاننے کا موقع ملے گا۔لیکن اگر آپ چھوٹی عمر میں ھی دنیا کے بڑے مذہبوں کے بارے میں اھم باتیں جان جائیں تو یہ معلومات آگے چل کر آپ کے کام آئے گا اور بہت سی الجھی ھوئی باتوں کو سمجھنے میں بھی آسانی ھو گی۔ اس کے علاوہ آپ کے ساتھی بھی آپ کے علم سے حیران رہ جائیں گے ۔یاد رکھئے ، علم ھمیشہ کام آتا ھے ، اور آپ کا علم بڑھانے کے لیے ھی ھم یہ سلسلہ شروع کر رھے ھیں۔ اسے پڑھکر ھمیں اپنی رائے ضرور لکھیے۔ مدیر

پیغمبر زرتشت کی شبیہ

زرتشتیت کو دنیا کے سب سے پرانے مذہبوں میں شامل کیا جاتا ہے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آج اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد بہت تھوڑی رہ گئی ہے ۔ ان تھوڑوں میں بھی سب سے زیادہ ہندوستان میں رہتے ہیں جب کہ یہ مذہب ملکِ فارس سے چلا تھا جسے آج آپ ایران کے نام سے جانتے ہیں۔اس مذہب کے دو اور نام بھی ہیں۔مزدائیت Mazdaism اور مجوسیت یا مجیانیت Magianism۔ یہ ایک قدیم ایرانی مذہب یا مذہبی فلسفہ ہے جس کے بانی ایک مذہبی فلسفی زرتشت تھے۔ان سے پہلے ایران میں بہت سے خداؤں کو مانا جاتا تھا لیکن حضرت زرتشت نے صرف ایک خدا کا تصور سامنے رکھا۔حضرت عیسیٰ سے ہزاروں سال پہلے کے اس مذہب میں آگ کو بے حد مقدس اور خدا کی خاص نشانی مانا جاتا ہے ۔اس مذہبی فلسفے کی بنیاد نیکی اور بدی کی دو مخالف طاقتوں کی کشمکش پر رکھی گئی ہے۔ نیکی کی قوت 'اہورا مزدا' ہے جو روشنی علم عرفان و آگہی اور تخلیق کی طاقت ہے اور وہی خدا ہے۔اس کے مقابلے میں اہرمن Ahriman یا انگرا مینیو Angra Mainyu تخریب، توڑ پھوڑ، گناہ اور بدی کی طاقت ہے۔زرتشتیوں کی مقدس کتاب ژند اوستا Zend Avesta ہے اور زرتشت کی لکھی ہوئی 17 مناجاتوں کو گاتھا Gatha کہتے ہیں۔ تمھیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ یہ مناجاتیں اسی بحر میں ہیں جس میں وید مقدس کے اشلوک لکھے گئے ہیں۔دراصل گاتھا پرانی اوستا Old Avestan زبان میں ہے جس کا تعلق قدیم ایرانی زبانوں کے قبیلے سے ہے اور جو اصل میں قدیم ہند یوروپی زبانوں کے مشرقی خاندان کا ہی ایک ایک حصہ ہے۔یہ بھی مانا جاتا ہے کہ ویدک زمانے کی سنسکرت کی مدد لیے بغیر گاتھا کو سمجھنا مشکل ہے۔حالانکہ گاتھا کی زبان ژند اور سنسکرت ایک ہی زبان سے

نکلی ہیں لیکن چونکہ دونوں زبانوں نے الگ الگ پرورش پائی ہے اس لیے طویل زمانہ گزرنے کے بعد ان زبانوں میں دوریاں بھی بڑھتی گئی ہیں۔

اس مذہب کے بانی حضرت زرتشت Zoroaster یا Zarathustra کو اگرچہ ایرانی پیغمبر مانا جاتا ہے لیکن اکثر تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ وہ ایران کے باہر شمال میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ لکھنے والوں کے مطابق وہ آج کے آذر بائیجان، تاجکستان، قزاخستان یا افغانستان کے کسی علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی زندگی کے بارے میں زیادہ تر معلومات زرتشتیوں کے مذہبی صحیفوں سے ہی ملتی ہے۔ وہ قدیم اوستا زبان بولتے تھے اور اپنی خاص کتاب یاسنا ہفت انگیتی Yasna Haptanghaiti اور گاتھا کی مناجاتیں انھوں نے اسی زبان میں لکھی تھیں۔ 'زر' اس زبان میں (اور فارسی میں بھی) سونے کو کہتے ہیں اور 'استر' یا 'تسترا' کے معنی ہیں اونٹ۔ لیکن، عوامی بول چال میں یہ لفظ روشنی اور دوست کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ ان کے زمانے کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ حوالوں میں انھیں حضرت عیسیٰ سے 6 ہزار سال پہلے کا بتایا جاتا ہے اور کچھ ان کے زمانے کو تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح کا بتاتے ہیں۔ زرتشت پجاریوں کے خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ تیس سال کے تھے جب ان پر اہورمزدا کا انکشاف ہوا اور انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ زرتشت کی وفات کیسے ہوئی یہ ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں قتل کیا گیا تھا۔

اس مذہب میں آگ کو بہت مقدس خیال کیا جاتا ہے جو زرتشتیوں کے نزدیک اہورمزدا اور روحانی زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عبادت خانوں میں آگ کی پوجا ہوتی ہے جنھیں فائر ٹیمپل Fire Temple کہتے ہیں۔ عرصہ تک یہ مذہب ایران اور اس کے شمالی علاقوں میں پھلتا پھولتا رہا۔ پہلے اہل فارس اور پھر ساسانیوں کی حکومتوں میں یہی ایرانیوں کا مذہب رہا۔

دادا بھائی نوروجی

جمشید جی ٹاٹا

ہومی جہانگیر بھابھا

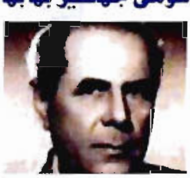
سہراب مودی

بعد میں عربوں نے ایران پر قبضہ کیا اور ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ لیکن مسلم حکمرانوں نے زرتشتیوں کے ساتھ، جنھیں وہ مجوسی کہتے تھے اچھا سلوک نہیں کیا جس سے اس قدیم مذہب کا زور گھٹنا شروع ہو گیا۔ اگلی تین سو سال میں اکثر زرتشتیوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے مذہب پر قائم رہنے والے زرتشتیوں کی تعداد ایران میں بہت کم رہ گئی۔ اب سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے 936 عیسوی میں ایران کے صوبہ خراسان کے شہر سنجان میں رہنے والے زرتشتیوں نے مسلم حکمرانوں کے ظلم سے تنگ آکر ایران چھوڑ دیا اور خلیج فارس میں ہرمز Hormuz کے سمندری راستے سے ہندوستان آگئے۔ یہاں وہ 19 سال تک جزیرہ دیو میں پڑے رہے اور آخر کار ساحل پر آکر گجرات کے علاقوں میں بس گئے۔ چونکہ وہ خطہ فارس یا پارس سے آئے تھے اس لیے یہاں انھیں پارسی کہا جانے لگا۔ گجرات سے یہ مہاراشٹر اور باقی ملک کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ لیکن ان کی خوش حالی کا اصل زمانہ انگریزوں کے دور میں شروع ہوا۔ ایران سے انھیں اپنے مذہبی بھائیوں پر ظلم وستم کی دکھ بھری داستانیں سننے کو ملتی تھی۔ بہت کچھ سننے کے بعد پارسیوں نے اپنے وفد ایران بھیجے جنھوں نے اپنے حسن سلوک سے مسلم بادشاہ قاچار کا دل جیت لیا اور اس نے زرتشتیوں پر سے جزیہ ٹیکس ہٹا لیا۔ اس سے ایران میں زرتشتیوں کے حالات زندگی میں بہتری آنے لگی۔ آج کے ایران میں بھی وہ بہتر زندگی گزار رہے ہیں لیکن ایرانی اور ہندوستانی پارسی اب نئے علاقوں میں جاکر بسنے کے لیے مغربی ملکوں کا رخ کرنے لگے ہیں۔

زرتشتیت میں سچ کے راستے پر چلنے کو سب سے زیادہ اونچی جگہ دی گئی ہے۔ مذہب کے تین اہم اصول ہیں: اچھی سوچ، اچھی بولی اور اچھا عمل۔ زرتشتیوں کے عقیدے کے مطابق موت کے بعد انسان کی روح تین دن اور تین رات تک اسی دنیا میں رہتی ہے۔ نیک انسان کو موت کے بعد رہنے کے لیے بہتر جگہ واہشتا آہو Vahishta

Ahu ملتی ہے اور برے آدمی کو بدترین جگہ اچشتا آہو Achista Ahu بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے جنّت اور دوزخ کے ہی دو نام ہیں۔ فارسی کا لفظ بہشت یعنی جنّت 'واہشتا' کی ہی بدلی ہوئی شکل معلوم ہوتا ہے۔

موت کے بعد پارسیوں کے جسم نہ دفنائے جاتے ہیں نہ جلائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا کرنے سے آہورمزدا کی تخلیق کی ہوئی زمین ناپاک ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میّت کو مینارۂ خاموشی Tower of Silence کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے، جہاں گدھ اسے کھا جاتے ہیں۔ یہ مینار دراصل ایک کنویں پر بنایا جاتا ہے جس میں اوپر کی طرف لوہے کی سلاخوں کا جال ہوتا ہے۔ اس جال پر رکھی میّت کا گوشت گدھ کھا لیتے ہیں اور ہڈیاں دھوپ میں سوکھ سوکھ کر نیچے کنویں میں گر جاتی ہیں۔ پارسیوں کے کچھ حلقے اب اس رواج کے خلاف آواز اٹھانے لگے ہیں اور اسے پسند نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اب گِدھوں کی تعداد بھی بہت کم رہ گئی ہے۔

دنیا میں زرتشتیوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں ہے، پھر بھی یہ سوا لاکھ سے تین لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں یہ سب سے زیادہ ہیں۔ ہمارے یہاں 69 ہزار پارسی رہتے ہیں جب کہ ایران میں ان کی تعداد 25271 بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد امریکہ میں 11 ہزار افغانستان میں 10 ہزار، پاکستان اور کناڈا میں پانچ پانچ ہزار، سنگاپور میں 4500 اور آسٹریلیا، آذربائیجان، خلیجی ملکوں اور نیوزی لینڈ میں ان کی تعداد دو ہزار اور 2700 کے بیچ ہے۔

زرتشتیوں کی تعداد اتنی کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کو اس مذہب میں داخل نہیں کیا جاتا۔ زرتشتی اپنی پیدائش سے ہی زرتشتی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں پارسی خاتون اگر کسی دوسرے مذہب کے شخص سے شادی کر لے تو اس کے شوہر اور بچّوں کو زرتشتی نہیں مانا جاتا۔ لیکن پارسی مرد کسی دوسرے مذہب کی عورت سے شادی کر لے تو صرف اس کے بچوں کو زرتشتی مانا جاتا ہے ماں کو نہیں۔ بعض پارسی عالموں کا کہنا ہے کہ یہ زرتشتی اصولوں کے خلاف ہے اور اس کے خلاف بھی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ پارسیوں کے یہاں اولادیں بھی کم ہوتی ہیں، اور یہ لوگ مغربی ملکوں میں جا کر بھی بسنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ان کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ 1983 میں ہمارے یہاں تین لاکھ پارسی تھے۔ اور اب 70 ہزار سے بھی کم رہ گئے ہیں۔ ایسے ہی چلتا رہا تو اگلے سات برسوں میں ہمارے یہاں صرف 23 ہزار پارسی رہ جائیں گے۔

بھیکا جی کاما

فرخ انجینئر

پرسس کھمباٹا

بومن ایرانی

ہندوستان کی ترقی میں پارسیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی شرح پارسیوں میں ہندوستان کی باقی سبھی قوموں سے زیادہ ہے۔ کل ملا کر 97 فیصد سے زیادہ۔ پارسی خیراتی کاموں میں سب سے زیادہ دل چسپی لیتے ہیں۔ سنسکرت میں اس لفظ کا مطلب ہی ہے خیرات کرنے والا۔ جن اہم پارسیوں نے اس ملک کو ہر شعبے میں ترقی دی ہے ان میں کچھ کے نام یہ ہیں: جمشید جی ٹاٹا، گودریج، لارڈ کرن بلی موریا اور واڈیا (صنعت و تجارت) فیروز شاہ مہتہ، دادا بھائی نورو جی، بھیکا جی کاما، فیروز گاندھی (سیاست اور ہندوستان کی تحریک آزادی) ہومی جہانگیر بھابھا، ہومی این سیٹھنا (سائنس) فیلڈ مارشل سیم مانک شا، ایڈمیرل جال خورشید جی، ایئر مارشل اسپی انجینئر (افواج) سہراب مودی، واڈیا برادرز، بلی موریا، اردیشر ایرانی، شاپور جی پالن جی، اسپی ایرانی، جال مستری (فلم اور تھیٹر) ناری کنٹریکٹر، فرخ انجینئر (کرکٹ) زوبین مہتہ، فریڈی مرکری، کے خسرو شاپور جی سہراب جی، بلوسی رانی (موسیقی) آر کے کرنجیا، اردیشر کاوس جی (صحافت) پرسس کھمباٹا، بومن ایرانی (اداکاری)...اور یہ فہرست کافی طویل ہے! ◻

◆ نصرت ظہیر، فروغ اردو بھون، جسولا انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی۔110025

عبدالصمد

عجیب کھلونا

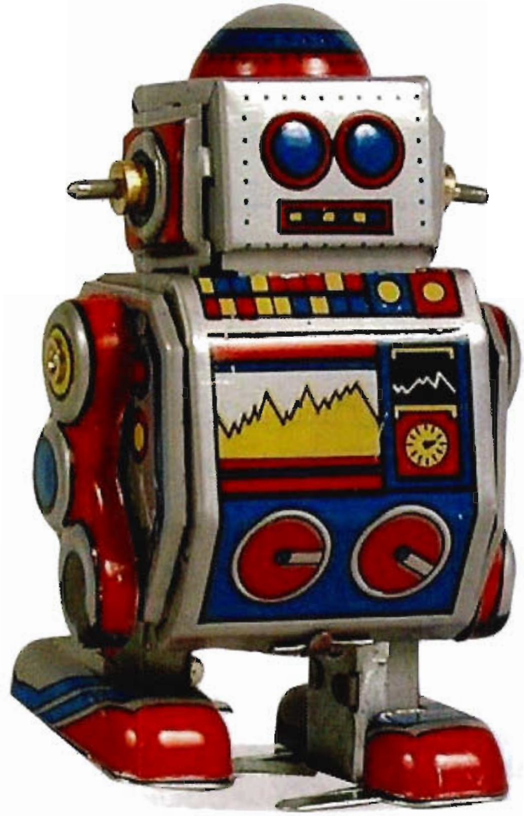

آصف اور واصف کے ابا واثق صاحب کی عادت تھی کہ وہ کبھی بھی خالی ہاتھوں، باہر سے آ کر گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ کبھی مٹھائی، کبھی پھل، کبھی کوئی کتاب، کبھی کھلونے ...اور سب چیزوں کے لئے جھگڑا تو نہیں ہوتا تھا۔ یعنی مٹھائی اور پھل وغیرہ آسانی سے تقسیم ہو جاتے۔ بس ذرا اس کا خیال رکھنا پڑتا کہ کسی ایک کے حصے میں رائی برابر بھی کمی بیشی نہ ہو۔ دونوں اپنے ہاتھوں کے پلڑے میں اس کے وزن کی جانچ کرتے رہتے۔ کتاب کا معاملہ یہ تھا کہ اس میں اگر تصویروں کی بھرمار ہوتی تب تو تھوڑی دیر اس کے لئے چھینا جھپٹی ہوتی ورنہ اس سلسلے میں دونوں بڑی فراخ دلی سے پہلے آپ...نہیں بھائی پہلے آپ...کے اصول پر کاربند ہو جاتے۔

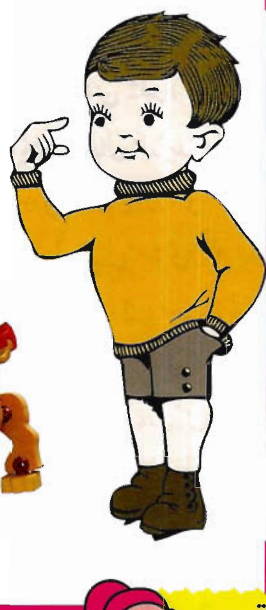

جھگڑے کی اصل وجہ کھلونے ہوا کرتے۔ وہ کھلونے میں شرکت داری کے بالکل قائل نہیں تھے۔ وہ اس ہر سو فی صد حصہ داری کو سختی سے مانتے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ واثق صاحب ہمیشہ دو عدد کھلونے لے کر آتے تھے۔ کھلونے بھی مختلف نہیں بلکہ ایک ہی جیسے ہونا ضروری تھے۔ شکل وصورت، رنگ و روغن، وزن اور اسٹائل وغیرہ میں بھی ذرّہ برابر فرق گوارہ نہیں ہوتا تھا۔ دوستوں، رشتہ داروں اور دور دراز سے آنے والے مہمانوں کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہاں کبھی ایک عدد کھلونا لے کر نہیں جانا۔ کسی آنے

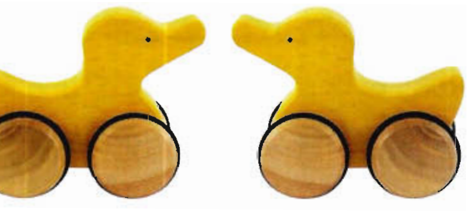

جناب عبد الصمد اردو کے بڑے مشہور ادیب ہیں جن کے ناول 'دوگز زمین' نے ایک زمانے میں بڑی دھوم مچائی تھی ۔ وہ کئی بڑے اعزاز پاچکے ہیں جن میں ساہتیہ کادمی ایوارڈ بھی شامل ہے۔ ان کی تحریریں بڑوں کے لیے ہوتی ہیں، لیکن ہماری درخواست پر انھوں نے تمھارے لیے ایک پیاری سی کہانی لکھ دی ہے۔ پچھلے ایک شمارے میں تم نے جناب سلام بن رزاق کی کہانیاں پڑھی تھیں جن پر کمپیوٹر کی غلطی سے کسی اور کا نام چھپ گیا تھا۔آئندہ شماروں میں بھی ہم تمھیں اردو کے مشہور فلم کاروں کی نگارشات پڑھواتے رہیں گے۔ مدیر

والے کو کبھی ایک ہی شکل وصورت کا کھلونا دستیاب نہیں ہوتا تو وہ وہاں کا سفر ملتوی ہی کر دینے میں ہی عافیت جانتا تھا۔

واثق صاحب اپنے بزنس کے سلسلے میں اکثر دورے پر رہتے۔ اس طرح انہیں اپنے بچوں کے لئے کبھی کبھی نایاب چیزیں بھی مل جاتیں۔ ایک بار انہیں ایک کھلونا بہت پسند آیا۔ وہ ایک عجیب وغریب شکل کا جانور تھا جس میں کئی چابیاں دی جاتی تھیں۔ ہر چابی پر اس کے اندر سے مختلف جانور کی آواز سنائی دیتی۔ مثلاً ایک چابی دینے سے کتے کے بھونکنے کی آواز، دوسری سے بلی کی، تیسری سے بکرے وغیرہ کی۔ واثق صاحب نے اس کھلونے کو فوراً خرید لیا۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ اس کا کوئی دوسرا نمونہ اس دوکان میں موجود نہیں تھا۔ انہوں نے شہر بھر کی دوسری دوکانوں میں اس کی تلاش کی، اسے ملنا تھا نہ ملا۔ ایک کھلونے کو لے کر گھر جانا گویا ایک آفت کو دعوت دینا تھا مگر وہ ان کے دل کو ایسا بھا گیا تھا کہ وہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ آخر انہوں نے یہ سوچ کر اسے خرید لیا کہ دوسرے شہروں کی دوکانوں میں تلاش کریں گے۔ انہیں ابھی آگے سفر کرنا تھا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی شہر کی کسی دوکان میں بھی اس کا دوسرا نمونہ نہیں ملا۔ واثق صاحب مغموم تو بہت ہوئے مگر اب تو وہ اس کھلونے کو نہ صرف خرید چکے تھے بلکہ اتنے دنوں میں اس سے کافی دل بھی لگا چکے تھے۔ چنانچہ مجبور ہوکر وہ ایک ہی نمونہ کے ساتھ گھر پہنچے۔ اگر چہ اس کے دوسرے نمونے کی کمی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے بہت سی دوسری چیزیں خرید لیں تھیں۔ مگر ان کے بچوں نے کھلونا دیکھا تو ساری چیزیں درکنار کر کے بس کھلونے کے پیچھے پڑ گئے۔ کچھ دیر وہ اس انتظار میں بھی رہے کہ شاید اس کا دوسرا نمونہ بھی نکلے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دوسرا نمونہ تھا ہی نہیں تو پھر نکلتا کہاں سے۔ دوسری طرف ان کے والد واثق صاحب بھی کچھ سوچ کر آئے تھے۔ انہوں نے کھلونے کی خصوصیات کی پوری نمائش کرنے کے بعد آصف سے پوچھا۔

''جانتے ہو، یہ کھلونا کس کا ہے...؟

آصف نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔

''یہ کھلونا تمہارا ہے...''

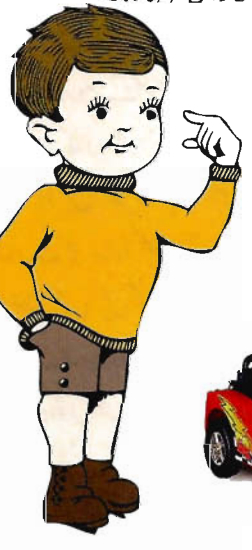

انہوں نے مسکراتے ہوئے آصف کی طرف دیکھ کر کہا۔ آصف کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا مگر واصف روہانسا ہو گیا۔ انہوں نے اس کو اپنی

گود میں اٹھالیا۔

''یہ کھلونا تمہارا بھی ہے بیٹے، جتنا آصف کا اتنا ہی تمہارا۔''

واصف کی آنکھوں کے آنسو اندر ہی اندر روک گئے۔ ویسے بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ادھر آصف کی خوشی کافور ہوچکی تھی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ واثق صاحب تھوڑی دیر تک دونوں کی کیفیت سے لطف اٹھاتے رہے، اتنے میں دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔

''واہ ابّو، یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا، ایک ہی کھلونا، ایک ساتھ ہم دونوں کا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہوسکتا ہے نا۔ وہ یوں کہ...''

واثق صاحب نے کھلونے کو ڈرائنگ روم کے تھوڑے اونچے مینٹل پیس پر رکھ دیا پھر انہوں نے آصف کو اس کے دائیں کھڑا کیا۔ ''اس رخ سے سارے کا سارا کھلونا تمہارا ہے...'' پھر واصف کو بائیں کھڑا کیا۔ ''اور ادھر سے سارے کا سارا واصف کا...''

دونوں اپنے والد کی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ واثق صاحب نے اس پر بس نہیں کیا۔ انہوں نے کھلونے کے دائیں آصف کے نام کی چٹ لگادی۔ بائیں واصف کے نام کی۔ اپنا نام باپ کے ہاتھوں سے لکھا اور کھلونے پر چسپاں دیکھ کر دونوں خوش ہوگئے تو اب بھی اس میں ایک کسر باقی رہ گئی تھی۔ وہ اب بھی اپنے والد کی بات کے قائل نہیں ہوسکے تھے۔

واثق صاحب اپنی ترکیب کوکارگر دیکھ کر بہت خوش ہورہے تھے۔ ایک ترپ کا پتہ اب بھی ان کے ہاتھوں میں باقی تھا۔

دونوں اپنے والد کی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ واثق صاحب نے اس پر بس نہیں کیا۔ انہوں نے کھلونے کے دائیں آصف کے نام کی چٹ لگادی۔ بائیں واصف کے نام کی۔ اپنا نام باپ کے ہاتھوں سے لکھا اور کھلونے پر چسپاں دیکھ کر دونوں خوش ہوگئے تو اب بھی اس میں ایک کسر باقی رہ گئی تھی۔ وہ اب بھی اپنے والد کی بات کے قائل نہیں ہوسکے تھے۔

واثق صاحب اپنی ترکیب کوکارگر دیکھ کر بہت خوش ہورہے تھے۔ ایک ترپ کا پتہ اب بھی ان کے ہاتھوں میں باقی تھا...

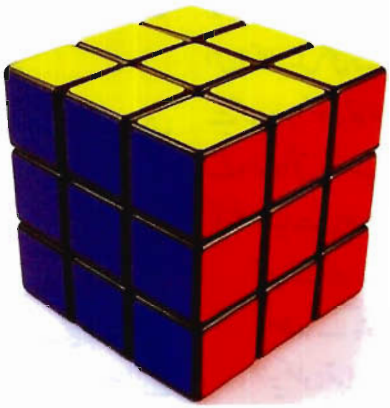

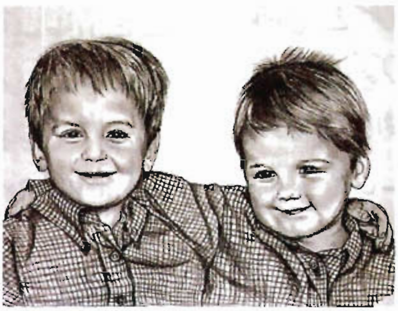

انہوں نے اپنے بیٹوں کو مخاطب کیا۔

''اب آپ لوگ اس سے کھیلنے کے لئے اپنا اپنا الگ وقت مقرر کر لیجئے۔ جس کا جو وقت ہوگا، اس وقت یہ کھلونا صرف اسی کے پاس ہوگا دوسرا اس میں دخل نہیں دے گا۔''

آصف اور واصف نے اپنے اپنے وقت مقرر کر لئے۔ تو اس وقت جو حصہ جس کے پاس آیا، انہوں نے کھلونا اتار کر اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اب جا کے دونوں کی سمجھ میں آیا کہ الگ الگ کھلونے کے لئے لڑ کر وہ کس قدر بے وقوفی کی حرکت کرتے تھے۔ وہ دونوں اپنے باپ سے لپٹ گئے جنہوں نے انہیں ایک خوبصورت سبق، کھیل کھیل ہی میں یاد کرادیا تھا۔ □

♦ عبدالصمد، A-212، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ۔ 010 800 بہار

□ اسنیٰ بدر

شکوے شکایت

اک روز یہ کوے نے کہا مجھ کو بلا کر
کیوں مجھ پہ ہے الزام کہ چالاک بہت ہوں
میں نے بھلا انسان کو نقصان دیا کیا؟
دل دل میں اسی سوچ سے غم ناک بہت ہوں

جنگل میں مجھے دیکھ کے اک لومڑی بولی
کیا میں ہی ملی ہوں تمھیں رسوائی کی صورت
دنیا میں کھلاتے ہو تمھیں پھول وفا کے؟
اور میں ہوں تمھارے لیے ہرجائی کی صورت؟

کچھ ایسی شکایت میرے طوطے نے بھی رکھی
آزادی کسے دنیا میں اچھی نہیں لگتی
تم قید کرو اڑنے کی خواہش نہ کریں ہم
یہ جھوٹی توقع مجھے سچی نہیں لگتی

چڑیاں بھی مجھے کمرے میں کرتی تھیں ملامت
پنجرے میں بسر کرنا کچھ آسان نہیں ہے
اللہ کی دنیا پہ ہمارا بھی تو حق ہے
انسان ہی سانسوں کا نگہبان نہیں ہے

ان شکووں نے سونے نہ دیا مجھ کو کئی دن
جھانکا بہت اس دل میں بہت سوچا ہے میں نے
کمزور پہ تہمت ہے غریبوں پہ حکومت
دنیا میں سدا ایسا ہی کچھ دیکھا ہے میں نے

◆ اسنیٰ بدر، ریاض، سعودی عربیہ

شکیل جاوید

ماں

راستہ ہموار ہو تو پیدل چلنے والوں کو منزل پر پہونچنے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن نصرو جس جنگل سے ہو کر گذر رہا تھا وہاں نہ کوئی سڑک تھی نہ ایک کے سوا کوئی اور پگ ڈنڈی۔ لوگوں نے جہاں سہولت اور آسانی پائی وہیں راستہ بنالیا تھا۔ علاقہ میدانی ہو یا پہاڑی وہاں پاؤں سے بنی پگ ڈنڈی اور اس کے دونوں سروں پر اُگی ہوئی گھاس اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ راستہ مختصر اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی ہے۔

نصرو اپنی ماں کے ساتھ ایک بار نہیں دسیوں بار اسی پگ ڈنڈی سے گھنا جنگل پار کر کے ندی پر پہونچا تھا۔ اسے ندی پار کر کے اس چھوٹی سی بستی میں پہونچنا تھا جہاں خوبصورت وادی میں اس کا ماموں شیر خان رہتا ہے۔ ایک بار اس کے پوچھنے پر ماں نے بتایا تھا۔

''بیٹا! ماں باپ میرے بچپن میں ہی گذر گئے تھے۔ بھائی نے جو مجھ سے بڑا تھا اولاد کی طرح پالا تھا مجھے، اور جب بڑی ہوئی تو اسی بھائی نے میرا بیاہ رچایا تھا۔''

جیسے جیسے نصرو سیانا ہو رہا تھا اسی طرح موقع بہ موقع وہ ماں سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتا تھا۔ ایک دن ماں نے اسے بتایا۔ ''کہ تیرا باپ بڑا بہادر اور جیالا تھا۔ اپنے قبیلے کا سردار بھی ایک بار تیرے باپ کی شیر سے ٹکر ہوگئی۔ پھر کیا تھا۔ دونوں میں گتھم گتھا ہوئی کبھی شیر اوپر تیرا باپو نیچے کبھی شیر نیچے اور تیرا باپو اوپر...ایک موقع پر تیرے باپو کے ہاتھ میں کلہاڑی آ گئی پھر کیا تھا۔ انھوں نے کلہاڑی سے شیر کو مار گرایا تھا...اور پھر ماں نے اسے روتے ہوئے بتایا تھا: ''ایک دن تیرا وہی بہادر باپ نہ مرا تو شیر سے نہ مرا...اور جب وقت آ گیا تو گھوڑے سے گر کر مر گیا...'' پھر اس نے نصرو کو گود میں بھر کر کہا تھا۔ ''اب تو ہی سہارا ہے بیٹے!...میں تیرے لیے ہی جی رہی ہوں۔'' اور وہ روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی۔

اس کے بعد کبھی بھولے سے بھی اس نے اپنے باپو کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اسے ماں کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ ماں کے چہرے پر مسکان دیکھنا چاہتا تھا۔

رات دن گذرتے گئے اور نصرو بڑا ہوتا چلا گیا...

اور آج وہ زندگی میں پہلی بار تنہا اس خوفناک جنگل سے ہو کر گذر رہا تھا۔ جہاں قدم قدم پر خطرہ تھا۔ جان لیوا خطرہ! اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں دور تک دیکھ رہی تھیں اور کان ذرا سی آہٹ پر خرگوش کی طرح کھڑے ہو جاتے۔ وہ بلا کا پھرتیلا تھا۔ چیتے کی طرح چالاک اور مضبوط۔ اس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ کھلی صحت مند فضاؤں میں بے فکری اور آزادی کے ساتھ رہنے والے یوں بھی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جاتے ہیں کیوں کہ پہاڑوں کی صاف ستھری تر و تازہ اور صحت مند ہوائیں کمزور ناتواں اور بیمار جسموں کو بھی صحت مند بنا دیتی ہیں۔

پچھلے ہفتہ سے نصرو پریشان تھا کیوں کہ اس کی ماں کو بہت تیز بخار تھا۔ وادی میں بنے ہوئے دوا خانے کے ڈاکٹر نے خون ٹیسٹ کر کے اس کی ماں کو میعادی بخار بتایا تھا۔ ڈاکٹر کی دی گئی دوا کو وہ پابندی کے ساتھ کھلا رہا تھا لیکن ابھی تک نہ تو بخار کم ہوا اور نہ کمزوری ہی دور ہوئی۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ کمزوری بڑھنے سے ماں کو غفلت بھی رہنے لگی دوسرے کچھ نہ کھانے سے وہ اور نڈھال ہوگئی تھی۔ نصرو بچہ ہی تھا۔ جہاں تک اس میں سمجھ تھی ماں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

ایک دن اس نے جب ماں کو زیادہ غفلت میں دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی اور وہ رونے لگا۔ اس کی پڑوسن اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کے کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ اسے خالہ کہتا تھا۔ وہی دوڑی چلی آئی۔ اس کی ماں کی حالت دیکھ کر گھبرا تو وہ بھی گئی لیکن اس

نے نہ صرف خود کو سنبھالا بلکہ نصرو کو بھی دلاسہ دے کر بتایا کہ وہ ماں کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں دکھائے۔لیکن یہ کام اکیلے اس کے بس کا نہ تھا اس لیے خالہ کے مشورے پر وہ اپنے ماموں شیر خان کے پاس جا رہا تھا۔خالہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی واپسی تک وہ ماں کی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔

گھنے جنگل کا علاقہ پار کر کے اس نے راحت کی سانس لی۔

ہوا بند ہونے سے گرمی بڑھ گئی تو پیاس سے اس کا گلا بھی سوکھنے لگا پسینے میں تر بتر تھا۔اسے معلوم تھا کہ جنگل کے ختم ہوتے ہی ندی پڑتی ہے جس میں صاف اور ٹھنڈا پانی بہتا ہے۔ٹھنڈے پانی کے خیال سے ہی اس کے جسم میں جان آ گئی وہ جلد سے جلد وہاں پہونچنا چاہتا تھا۔اس لیے تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔لیکن راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے وہ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

منزل سامنے دیکھ کر مسافر کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں رہتا۔منزل کی خوشی راہ کی مشکلوں کو بھی بھلا دیتی ہے۔وہ چاہتا تھا کہ میرے پنکھ لگ جائیں اور میں پلک جھپکتے ہی منزل پر پہونچ جاؤں!

اب ندی اسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔اس کے ٹھنڈے صاف پانی سے ہاتھ منہ دھو کر اس نے اوک سے پانی پیا جس سے اس کے جسم میں تازگی اور توانائی بھر آئی۔وہ کچھ دیر وہاں بیٹھنا چاہتا تھا۔یکا یک اسے ماں کا خیال آیا جسے وہ خالہ کو سونپ کر آیا تھا۔وہ سوچنے لگا...اللہ جانے کس حال میں ہوگی میری ماں...؟

”جلدی کر اپنے ماموں کو ساتھ لے کر ماں کو شہر کے اسپتال میں دکھانا ہے تجھے...“

یہ آواز اسے اپنے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔کسی فوجی کی طرح وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا۔ندی پر نظر دوڑائی جس میں تھوڑا تھوڑا پانی بہہ رہا تھا اور جو آئینہ کی طرح صاف تھا۔اس میں اٹھلاتی ناچتی ننھی ننھی مچھلیاں دیکھ کر اسے اچھا لگا۔پانی کے اوپر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں ندی کے دوسرے کنارے پہ پہونچیں، جہاں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک شیر پانی پی رہا تھا۔اسے دیکھ کر نصرو گھبرا گیا لیکن وہ تو جنگل کا باسی تھا کئی بار اس طرح کے دوسرے درندوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔البتہ شیر کو اتنے قریب سے کھلے علاقہ میں دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس کا۔

وہ اسی جگہ سے ندی پار کرنا چاہتا تھا کیوں کہ یہاں پانی کم تھا اسے شیر کا ڈر نہ تھا۔بس اپنی ماں کی فکر تھی جس کا حال بتانے کے لیے وہ جلدی سے اپنے ماموں شیر خاں کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ندی پار کرنے کے لیے احتیاط کے ساتھ اس نے اپنا قدم پانی میں اتارا...اور پھر دوسرا قدم بھی۔اس کی آنکھیں چوکنا ہوئیں تو اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی کے دستے پر اس کی گرفت بھی مضبوط ہوگئی۔

اب شیر پانی پی کر کھڑا ہو گیا تھا۔وہ نصرو کو ندی پار کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔شیر کو اتنے قریب دیکھ کر بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہ رکے وہ اور محتاط ہو گیا۔اس نے کلہاڑی کا دستہ اور بھی مضبوطی سے تھام لیا۔

یکا یک نہ جانے کیا ہوا۔دوسرے ہی پل شیر گردن گھما کر گھنے جنگل میں چلا گیا۔بچّے پر وار کرنا شاید اسے اپنی شان کے خلاف لگا تھا۔تب تک نصرو نے ندی پار کر لی تھی اور اب وہ بے خوف و خطر ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔اس آبادی کی طرف جہاں اس کا ماموں شیر خان رہتا ہے۔□

◆ شکیل جاوید بازار شفاعت پوتہ، امروہہ، یوپی

□ حبیب ریتھ پوری

چھناکے

کوئی تیس، بتیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میں چینی مٹی کے برتنوں کی ایک دوکان میں یوں ہی چند چیزوں کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ اسی وقت دوکان میں ایک مرد اور عورت ایک پانچ چھ سال کے بچہ اور سال ڈیڑھ سال کی بچی کو گود میں اٹھائے داخل ہوئے۔ وہ لوگ کار سے آئے تھے۔ باوردی ڈرائیور اور حکم کا منتظر ایک ملازم بھی ساتھ تھا۔ زیورات سے لدی پھندی عورت اور سوٹ بوٹ میں ملبوس مرد ایک شانِ بے نیازی سے داخل ہوئے تو کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے لے کر سیلز مین تک سب ان کی آؤ بھگت میں لگ گئے۔ انھیں ادب سے سلام کیا گیا اور ان کی خدمت کے لیے مستعد ہو گئے۔ ساتھ آیا ہوا بچہ کراکری کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے ایک برتن چھوٹ کر پکے فرش پر گرا اور چھناک سے ٹوٹ گیا۔ سب لوگوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ کچھ کے چہرے پر فکرمندی اور نقصان کے احساس سے مرجھا گئے۔ مگر بچے پر اس کا کوئی اثر دکھائی نہ دیا۔ دوکان مالک نے خوش مزاجی سے کہا ”جانے دو بچہ ہے۔“ اس پر والدین نے قہقہہ لگا کر کہا ”بڑا شریر ہے، ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے، خیر ہم نقصان بھر دیں گے آپ بے فکر رہیے۔“ اور بچے کو مخاطب کرتے ہوئے اسے مزید شہ دی، ”ہاں بیٹے دیکھو اور کیا کیا دیکھنا ہے، جو پسند آجائے وہ یہاں لیتے آنا۔“ بچے پر نہ تو اس نقصان کا کوئی اثر تھا نہ اس شہ کا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ آگے بڑھتا رہا۔ برتن ٹوٹتے رہے۔ اب دوکان مالک کے چہرے پر ناگواری اور ناراضی کے ہلکے ہلکے آثار ظاہر ہونے لگے تو مرد نے اپنے کوٹ کی جیب سے چیک بک نکالی چیک پر دستخط کئے اور دوکان مالک کی طرف یہ کہہ کر بڑھا دیا کہ ”نقصان کا حساب کرکے رقم آپ لکھ دینا“ اور پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”بیٹا توڑلو اور کیا کیا توڑنا ہے۔“ دوکان مالک کی جان میں جان آگئی اور بیٹے کی کاروائی میں اضافہ ہوگیا۔

میں یہ سب دیکھ کر دوکان سے خالی ہاتھ لوٹ تو آیا مگر اس واقعہ کا بوجھ میرے ذہن اور دل پر کچھ ایسا تھا کہ شروع کے ہفتہ بھر ہر دم ہر لمحہ میری آنکھوں میں دوکان کا منظر گھومتا رہا۔ میں دل کو بہلانے کے لیے خود کو مصروف رکھنے اور وہ منظر بھلانے کی کوشش کرتا مگر ہوتا اس سے الٹ۔ جتنا بھی بھولنے کی کوشش کرتا وہ اتنا زیادہ ذہن پر چھانے لگتا۔ مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس واقعہ کو بھول گیا۔ لیکن زخم بھر بھی جائے تو اس کے نشان باقی رہتے ہیں جیسے

دیکھ کر وہ سارا واقعہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ پھر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوتا رہتا تھا۔

تقریباً تیس سال بعد کل میں بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک سبزی فروش کی گاڑی پر ایک جوڑے کو بھاؤ تاؤ کرتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ شکلیں جانی پہچانی لگتی تھیں۔ لباس کی نفاست بھی مانوس سی تھی۔ ان کی عمروں پر تیس سال کی سردی گرمی نے جو تاثر چھوڑا تھا وہ شکلوں سے ظاہر تھا۔ میں نے یادداشت پر زور ڈالا تو تیس سال پہلے کا منظر نگاہوں میں گھومنے لگا۔

میں نے سبزی والے سے ایک دو چیزوں کے بھاؤ معلوم کیئے اور بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے جوڑے سے مخاطب ہو کر کہا ''مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔'' اس پر مرد نے اپنے ردِعمل اور رائے کا اظہار کرنا شروع کیا ''ہاں...تیس سال پہلے یہ لہسن بیس روپے پاؤ ملتا تھا۔ اب ساٹھ روپے پاؤ ہو گیا ہے۔ یعنی کہ تین سو گنا...''

بات کرنے کے لیے ایک موضوع میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے اسی کو آگے بڑھانے کے بعد کہا۔ ''آپ کی شخصیت کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے آپ کو تقریباً تیس برس پہلے چینی مٹی کے برتنوں کی ایک دوکان میں دیکھا تھا۔ اس وقت آپ کے ساتھ کوئی پانچ برس کا بچہ بھی تھا۔''

اب وہ مجھے حیرت سے تکنے لگا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بچہ دوکان میں رکھے برتنوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے توڑ رہا تھا۔ دوکان مالک کی ناراضی کو دیکھ کر آپ نے اسے کورا چیک کاٹ کر دیا تھا۔''

تیس برس کے واقعہ کی پوری روداد سن کر وہ شخص چونک گیا اور میرے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس کے بعد وہ ساتھ والی عورت سے بولا ''شوبھا انھیں جانتی ہو۔'' عورت نے انکار میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگا۔ ''جانتا تو میں بھی نہیں۔ مگر یہ ہم کو جانتے ہیں۔ آؤ ان کے ساتھ بیٹھ کر پرانی باتیں یاد کر لیتے ہیں۔ شاید ہمارا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔''

اس شخص نے جسے اس کی بیوی نے راکیش کہہ کر مخاطب کیا تھا مجھے کافی

پینے کی دعوت دی جو میں نے بخوشی قبول کر لی، کیونکہ میں اس بچے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

چائے خانے کے ایک نسبتاً خاموش کونے میں ہم لوگ کرسیوں پر جا بیٹھے۔ ناشتہ اور کافی کا آرڈر دیا گیا۔

میں نے باتوں کی کڑی کو جوڑنے کے لیے بچے کے متعلق پوچھا تو راکیش کے چہرے پر ایک الگ سا رنگ آ کر مردنی سی چھا گئی۔ شوبھا کی تو گویا زبان ہی بند ہو گئی تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد راکیش نے سکوت توڑا۔ ”کیا بتائیں بھیا“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ اجنبی کے سامنے اپنا دُکھڑا بیان کریں یا نہ کریں۔ یا پھر بکھری کڑیاں جوڑ رہا تھا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

”ہمارا وہ بیٹا راجیش جو بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ہماری آنکھوں کا تارا، جینے کا سہارا، امیدوں کا مرکز اور مستقبل کا خواب تھا۔ ہم نے اس کی پرورش میں کوئی کسر یا کمی نہیں چھوڑی تھی۔ بچپن سے لاڈ پیار و ناز سے اس کی پرورش کی۔ اس کی ہر جائز ناجائز ضد کو پورا کیا۔ اسے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ قیمتی خوبصورت کھلونوں سے کمرے بھر دیے۔ اس نے جو مانگا جو چاہا اسی وقت حاضر کر دیا گیا۔ اس کے لباس کھانے پینے اور علاج معالجہ میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ ایک مشہور اسکول میں داخلہ کرایا گیا، اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہر سہولت مہیا کی گئی۔ اسکول آنے جانے کے لیے کار، یونیفارم، کتابیں، میز، دوپہر کے لنچ کے لیے عمدہ کھانے، گھر پر پڑھائی کرنے کے لیے ایک بہترین روم سارے لوازمات کے ساتھ اس کے لیے الگ کر دیا گیا۔ ٹیوشن کے لیے ٹیوٹر گھر آ کر پڑھاتے۔ لیکن بچپن کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑی ہوئی عادتیں اب پختہ ہو گئیں تھیں۔ پڑھائی میں اس کی توجہ کم شرارتوں میں زیادہ رہتی تھی۔ استادوں کی حکم عدولی، اس کا دستور بن گیا تھا۔ اسکول میں ساتھیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا، مار پیٹ روز کا معمول تھا۔ مگر ہماری سماجی حیثیت کے پیشِ نظر بہت ساری باتیں ہم تک پہنچتی ہی نہیں تھیں اور ہم لوگ حقیقت سے بے خبر اسے ساری سہولتیں اور آرام و آرائش کی چیزیں دے کر مطمئن تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنا اور ڈانٹ ڈپٹ سے باز رہنا مناسب سمجھتے تھے۔

”اس کی پیدائش کے دو سال بعد ہمارے گھر بیٹی نے جنم لیا۔ شروع میں بیٹی پریا کی آمد بن بلائے مہمان کی سی رہی۔ راجیش کے ٹوٹے پھوٹے کھلونے اس کا مقدر ہوئے۔ لاڈ پیار بھی دوسرے درجہ کا دیا گیا۔ لباس کھانے پینے، علاج معالجہ، پڑھائی لکھائی پر بھی خرچ واجبی سا ہوا۔ نسبتاً کم خرچ والے اسکول میں اس کا داخلہ کرایا گیا۔ آنے جانے کے لیے کار کی بجائے آٹو رکشا، ٹیوشن کے لیے ٹیوٹر کے گھر جا کر دیگر بچوں کے ساتھ پڑھنا۔ مگر وہ توجہ سے پڑھتی تھی۔ شاید اسے اپنے دوسری اولاد ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ نہ کبھی ضد نہ غصہ اس لیے ہماری توجہ بھی اسے زیادہ نہیں ملی۔ اس نے اچھے نمبروں سے دسویں پاس کی۔ اس وقت راجیش دسویں میں پہنچا۔ ہائی اسکول میں پہنچتے پہنچتے راجیش آوارہ مزاج، ضدی، اڑیل، اوباش بن چکا تھا۔ جبکہ پریا اس سے چھوٹی ہونے کے باوجود اس سے آگے نکل چکی تھی۔ فرمانبردار، ذمہ دار، سمجھدار اور

باشعور ہوچکی تھی۔ بڑے بھائی کی اس حالت کا اسے بھی احساس ہو چکا تھا۔ مگر کچھ بول نہیں پاتی تھی۔

جونیئر کالج میں دونوں ساتھ ہی داخل ہوئے۔ مگر راجیش کے شو ق اب پڑھائی کی بجائے اوباش جوانوں کی صحبت میں سگریٹ شراب تک پہنچ چکے تھے۔ جوا تک اس کے شوق میں شامل ہو چکا تھا۔ ایک سال کالج میں گذار کر راجیش نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ جبکہ پریا نے تین سال میں گریجویشن مکمل کرکے بی ایڈ میں داخلہ لے لیا اور پھر بی ایڈ کے بعد ایک ہائی اسکول میں ٹیچر ہوگئی۔ راجیش کی شادی کا ہمیں بڑا ارمان تھا۔ مگر اس نے ہمارا یہ خواب بھی ایک چھناکے کے ساتھ چکنا چور کردیا۔ ایک دن ایک لڑکی جس کی مانگ میں سیندور اور گلے میں منگل سوتر تھا ہمارے سامنے لاکر کھڑا کردیا اور آشیرواد مانگ لیا۔ ہم نے مجبور ہوکر اس کی بچپن کی ضد سمجھ کر اسے قبول کرلیا۔

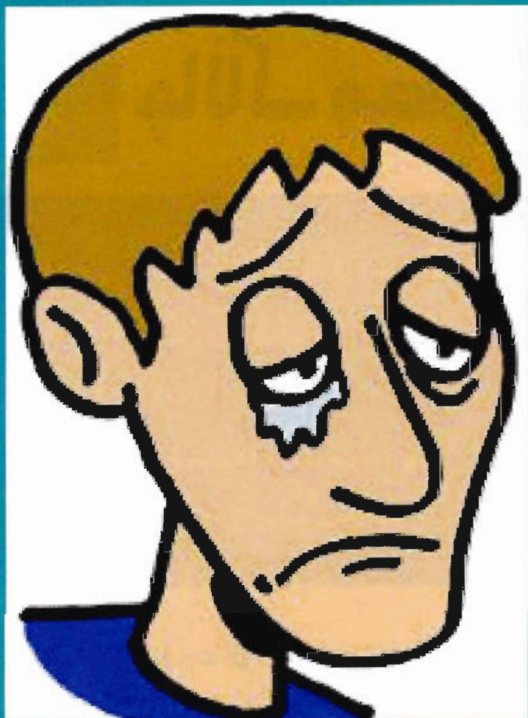

''بیٹی کی شادی ہم نے ایک فرض سمجھ کر کردی۔ داماد ایک کالج میں لکچرار ہے۔ انتہائی شریف النفس، فرض شناس اور ہمدرد، نہ کوئی لین دین نہ کوئی فرمائش بس جوڑے دیا اسی میں راضی وخوش ہے۔ دونوں کی زندگی خوشی اور شادمانی سے بسر ہورہی ہے جسے دیکھ کر ہمیں روحانی خوشی ہوتی ہے۔

''سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ہمیں سرکاری بنگلہ خالی کردینا پڑا۔ فنڈ اور گریجویٹی کی رقم سے گھر بنانے کا منصوبہ بھی دھرا کا دھرا رہ گیا۔ پوری رقم کاروبار شروع کرنے کے بہانے راجیش نے ہم سے مانگ لی۔ مانگ کیا لی چھین لی۔ اور ہم پرندہ کی طرح پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔ کاروبار تو کیا چلتا، اپنی پسند کی شادی، دولت کی ریل پیل، من مانی زندگی اور فضول خرچی کی وجہ سے وہ دولت برف کے تودے کی طرح گھلتی گئی۔ وہ اب ہم سے الگ ہوکر دور کسی دوسرے شہر میں رہنے کے لیے چلا گیا ہے۔ اور ہم اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے ایک فلیٹ میں کرایہ پر رہتے ہیں۔ باوردی کار ڈرائیور اور ملازم رکھنے کی پینشن میں گنجائش نہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ہم دونوں ہی بیمار رہنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کے بھاری بھرکم بل نے پینشن کی رقم کو نگلنا شروع کردیا ہے۔ اب ہمیں راجیش کی کوئی خبر نہیں ہے۔ نہ ہی اسے ہماری خیریت معلوم کرنے کی ضرورت اور فکر ہے۔

''پریا اور اس کا شوہر اکثر وبیشتر ہماری خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔ پریا کے شوہر نے پریا کی تنخواہ کا کچھ حصہ ہمیں دینے کا آفر بھی کیا ہے۔ مگر ہماری خودداری اور انا اسے قبول نہیں کرتی۔ بس سفید پوشی کا بھرم رکھنا ہے۔ ہمارے تو سارے ہی خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔''

چینی مٹی کے برتنوں کی دوکان میں گر کر ٹوٹنے والے برتنوں کے چھناکے میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ کوراچیک، بیٹے کو شہ دینے والے جملے، اور نجانے کیا کیا...

اور جب میں ماضی سے حال میں لوٹا تو دل بے حد اداس اور بے چین تھا! ◻

آکاشوانی ناگپور کے اردو پروگرام 'آبشار' سے نشر ہوا

♦ حبیب ریتھ پوری، بہادر پورہ ریتھ پور، تعلقہ مورسی۔ امراوتی مہاراشٹر

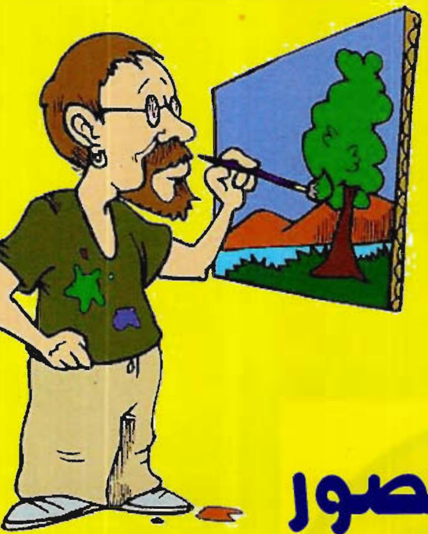

کہانی

□ سمیع الدین خاں شاداب

چالاک مصور

یہ کہانی ہندی کے مشہور شاعر رام نریش ترپاٹھی کی ایک نظم 'چتُر چِتر کار' سے لی گئی ہے۔ رام نریش ترپاٹھی (پیدائش 1889، وفات 1962) اتر پردیش میں ضلع جون پور کے کوری پور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم درجہ نو تک ہی جاری رہ سکی۔ ایک طرح سے انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو پڑھایا اور اس طرح پڑھ کر ہی ہندی، سنسکرت، بنگلہ، گجراتی اور انگریزی سیکھی۔ رام نریش ترپاٹھی کا شمار ہندی کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ شاعری میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی، کتھا گیتوں کے تجربات اور وطن پرستی کے جذبات سے بھرپور نظموں کے لیے کافی مشہور ہیں۔ ترپاٹھی جی نے بچوں کے لئے بھی ادب تخلیق کیا۔ **مصنف**

ایک مصور تھا، مصور یعنی تصویریں بنانے والا۔ وہ بہت ہی خوب صورت تصویریں بناتا تھا۔ لیکن اس کی ایک پریشانی تھی۔ وہ جب بھی کوئی اچھی تصویر بنانا شروع کرتا گھر کے بچے شور مچانے لگتے یا گھر کے پاس کی عبادت گاہ سے بہت زور زور کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں یا پھر کوئی اس سے ملاقات کے لئے چلا آتا اور بس اس طرح اس مصور کی یکسوئی ختم ہو جاتی۔ اور بچو! تم تو جانتے ہی ہو کہ کسی کام کو اچھی طرح انجام دینے کے لئے یکسوئی کتنی اہم ہوتی ہے۔ مصور کی یکسوئی ختم ہونے سے تصویر کی خوبصورتی پر ایسا برا اثر پڑتا کہ تصویر بھدی اور بدنما دکھائی پڑنے لگتی۔

مصور بہت کوشش کرتا کہ کسی طرح ان حالات سے چھٹکارا مل جائے اور پوری یکسوئی سے تصویر بنائے مگر وہ ان حالات کو بدلنے میں ناکامیاب رہتا اور اس ناکامیابی سے اس میں اور زیادہ جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی، اس کے مزاج میں چڑچڑاپن اور غصہ پیدا ہونے لگتا اور وہ زیادہ ترپریشان رہتا۔ مصور جانتا تھا کہ وہ بہت ہی خوبصورت تصویر بنا سکتا ہے لیکن اِس کے لئے اس کو پوری یکسوئی چاہئے۔

آخر کار ایک دن اس نے ایک ترکیب سوچ ہی لی۔ وہ اپنا مصوری کا سامان برش، رنگ، قلم، پنسل، کینوس، فریم وغیرہ اٹھا کر پاس کے ایک جنگل چلا گیا۔ جنگل ایک ندی کے کنارے تھا۔ جنگل میں طرح طرح کے پیڑ پودے، جھاڑیاں، گھاس تو تھی ہی۔ وہاں طرح طرح کے پرندے، جانور، تتلیاں، پھول، پھل اور خوبصورت قدرتی مناظر

بھی تھے۔ یہ سب اس کے لئے بڑا اچھا تھا۔ وہ ہر طرف قدرتی نظارے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کے ذہن کو بہت سکون حاصل ہوا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور سوچا کہ اب میں اچھی اچھی تصویریں بنا سکوں گا۔ قدرتی نظاروں کی تصویریں تو ویسے بھی بہت دلکش ہوتی ہیں۔

اس نے فریم پر کینوس لگایا اور تصویر بنانا شروع کردی۔ وہ خوبصورت پھولوں سے بھری جھاڑیوں اور پیڑوں اور پس منظر میں بہنے والی ندی کی تصویر بنانے لگا۔ ابھی وہ مشکل سے آدھی تصویر بھی

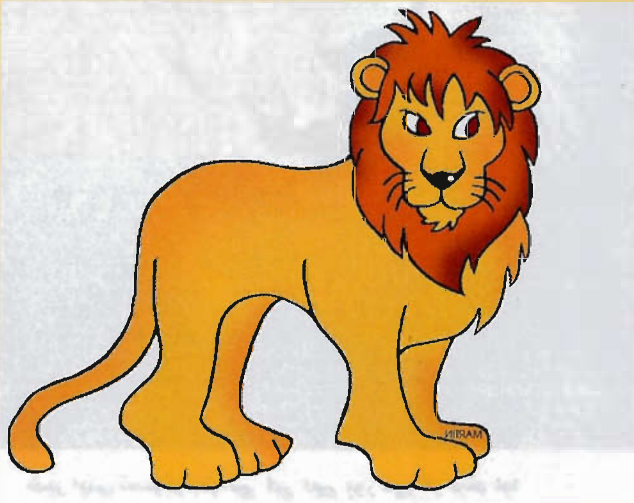

نہیں بنانے پایا تھا کہ اس کے دائیں جانب کی جھاڑیوں میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ جھاڑیوں کی طرف دیکھتے ہی اس کے پسینے چھوٹ گئے ،ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں اور اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اس نے دیکھا وہاں ایک شیر تھا اور وہ شیر اسی کی طرف چلا آرہا تھا۔

پہلے تو مصور گھبرا گیا لیکن بھلا گھبرانے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تیزی سے سوچنے لگا۔ اس مصیبت میں گھبرانے کچھ نہیں ہوگا بلکہ عقل سے کام لے کر ہی بچا سکتا ہے۔ اس بیچ شیر اس کے کافی قریب آچکا تھا۔

کسی طرح ہوش وحواس اکٹھے کر کے مصور نے شیر سے پوچھا۔

''آیئے جنگل کے راجا! اِدھر کیسے آنا ہوا؟''

''مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ میں کھانے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا، ادھر سے گزر ہوا تو تیری خوشبو آئی اور تجھے کھانے کے لئے یہاں چلا آیا۔''

''لیکن میں تو تصویر بنا رہا ہوں، تم مجھ کو چھوڑ دو اور یہ تصویر لے لو، دیکھو کتنی خوبصورت تصویر ہے۔'' مصور نے کانپتی ہوئی آواز میں بڑی مشکل سے کہا۔

''ارے مصور! میں اس تصویر کا کیا کروں گا، مجھے تو تیرا لذیذ گوشت کھانا ہے۔'' شیر نے اپنی لال لال زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

''اَے جنگل کے راجہ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ ایسا ہے کہ تم مجھ کو بعد میں کھا لینا، پہلے اپنی ایک خوبصورت سی تصویر تو مجھ سے بنوالو۔''

مصور کے دماغ میں اب ایک پلان آنے لگا۔

''نہیں نہیں... میں اپنی تصویر کا کیا کروں گا؟ وہ میرے کس کام کی؟''

''ارے مہاراج! آپ کی تصویر تو بڑے کام کی چیز ہوگی۔ اس کو اپنی گپھا کے دروازے پر بڑے شان سے لگانا، اس کے نیچے لکھا ہوگا 'جنگل کا راجا' اس سے تمام جانوروں کو معلوم ہوگا کہ یہ ہمارے جنگل کے راجا کا محل ہے اور سبھی جانور آپ سے واقف بھی ہو جائیں گے۔''

شیر نے سوچا ''یہ تو بڑے پتے کی بات کر رہا ہے۔ میری تصویر جب گپھا پر لگی ہوگی تو کسی دشمن کو ادھر آنے کی ہمت بھی نہیں پڑے گی پھر میرا رعب اور دبدبہ آس پاس کے جنگلوں پر بھی چلنے لگے گا۔''

شیر اپنی تصویر بنوانے کے لیے پوز دے کر بیٹھ لیا

اس نے مصور سے کہا'' ٹھیک ہے! تم پہلے میری تصویر بنالو میں تمھیں بعد میں کھالوں گا۔''

مصور کی طرف منہ کر کے شیر تھوڑے ہی فاصلے پر بیٹھ گیا اور پھر مصور بہت ہی دھیرے دھیرے تصویر بنانے لگا۔ بیچ بیچ میں شیر ٹوک دیتا'' جلد کرو، بھائی مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔''

مصور جواب دیتا'' ہاں حضور! بس ابھی تیار ہوئی جاتی ہے۔''

اور پھر کئی گھنٹے میں شیر کی تصویر بن ہی گئی لیکن اسی درمیان مصور نے اپنے بچنے کی ترکیب سوچ لی۔

''لو شیر راجا! تمہاری سامنے کی تصویر تیار ہوگئی۔'' مصور نے شیر کو تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

شیر کھڑا ہوا، اس نے ایک لمبی انگڑائی لی اور خوشی سے ایک زبردست دہاڑ لگائی۔ پورا جنگل گونج اٹھا اور مصور کو لگا جیسے اس کا دم ہی نکل جائے گا لیکن اس نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے اور پوری ہمت اور خود اعتمادی سے بولا ''لیکن مہاراج...''

''لیکن کیا؟'' شیر نے بے صبری سے پوچھا۔

''مہاراج! یہ آپ کے سامنے کی تصویر ہے۔ ابھی آپ کی پیچھے سے تو تصویر بنی ہی نہیں۔'' مصور نے مسکرا کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' شیر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''مطلب یہ کہ مہاراج، یہ تو صرف آپ کے چہرے کی ہی تصویر بنائی ہے ابھی یہ نامکمل تصویر ہی اتنی خوبصورت ہے تو جب آپ کی مکمل تصویر بن جائے گی تو وہ کتنی خوبصورت اور شاندار ہوگی۔'' مصور نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ کتنی دیر میں بنے گی؟'' شیر سے اب بھوک برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''ارے مہاراج اصل دیر بس چہرہ بنانے میں لگتی ہے باقی جسم تو بس چٹکی بجاتے ہی بن جائے گا'' مصور نے اپنی چال چلی۔

اپنی تصویر دیکھ کر شیر بہت خوش ہوا لیکن مصور مطمئن نہیں تھا

''ٹھیک ہے، میں تمہاری طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاتا ہوں لیکن ذرا جلدی بنانا مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔'' شیر راضی ہو گیا۔

''بس مہاراج آپ دیکھتے جایئے، چند منٹوں میں تصویر تیار کیے دیتا ہوں۔''

اور شیر دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ بس اب موقع اچھا تھا۔ مصور نے دھیرے دھیرے وہاں سے کھسکنا شروع کیا اور بغیر کسی آواز کے دبے پاؤں ندی کے کنارے تک آ گیا۔ وہاں کنارے پر اس کو ایک پرانی کشتی دکھائی دی وہ فوراً اس کشتی پر سوار ہو گیا اور ایک بانس کی مدد سے کشتی چلاتا ہوا ندی پار کرنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں کافی دور نکل گیا۔

ادھر شیر جو مصور کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ پیچھے سے کسی بھی قسم کی آہٹ یا آواز ہی نہیں آ رہی تو اس نے مصور کی طرف مڑ کر دیکھا۔

مگر یہ کیا؟ مصور تو غائب ''ارے یہ آدم زاد تو مجھے دھوکا دے گیا، مجھے اس کی باتوں پر یقین ہی نہیں کرنا چاہیے تھا'' یہ سوچ کر اس نے غور سے چاروں طرف دیکھا تو اس کو معلوم ہوا کہ مصور تو فرار ہو چکا ہے ذرا اور نظر دوڑائی تو کیا دیکھتا ہے کہ مصور ندی کو پار کرنے ہی والا تھا۔

شیر کی جھنجھلاہٹ کا تو ٹھکانہ نہ رہا اچھا خاصا شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ اب اس تصویر کو لے کر کیا کروں۔ مایوس ہو کر شیر نے زور سے پکارا۔

''ارے بھائی مصور کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

''اپنے گھر'' مصور نے چیخ کر جواب دیا۔

''ارے بے وقوف آدمی! اپنا برش، رنگ اور پنسل تو لیتے جاؤ۔'' شیر نے آخری کوشش کی۔

''مہاراج! اس برش اور رنگ سے آپ خود تصویریں بنایا کریں اور ہاں ہر تصویر کو دونوں طرف سے بنانا، سامنے سے بھی اور پیچھے سے بھی۔''

یہ کہتے کہتے مصور ندی کے پار اتر گیا اور اپنے گھر کی طرف بھاگتا ہوا چل دیا۔ ادھر شیر مارے جھنجھلاہٹ کے غرا غرا کر تصویر کے ٹکڑے کرنے لگا۔

شیر نے مصور کو بھاگتے دیکھ کر اسے اپنا سامان لے جانے کے لیے زور سے پکارا مگر مصور اس کی چال سمجھ گیا تھا

تو دیکھا بچو! کس طرح سمجھداری سے مصور کی جان بچ گئی۔ □

◆ ڈاکٹر سمیع الدین خاں شاداب

نظم

حیدر بیابانی

کہانی سناؤ

کہانی سناؤ، کہانی سناؤ
کہانی نئی یا پرانی سناؤ

کہانی پرانی وہ راجاؤں والی
وہی شان وشوکت شہنشاہوں والی
وہ ہاتھی وہ گھوڑے وہ محلے دو محلے
تصور سے جن کی ذرا دل تو بہلے
وہ دربارِ شاہی کے دل کش فسانے
وہ زرین گھڑیاں وہ چم چم زمانے
تھا سونے کی چڑیا یہ بھارت ہمارا
بلندی پہ تھا اس کی قسمت کا تارہ

یہ سب کچھ ہمیں آج نانی سناؤ
کہانی سناؤ، کہانی سناؤ

سناؤ کہ جب تھا خزاؤں کا موسم
جب اپنے وطن ہی میں مجبور تھے ہم
غلامی کا تھا دور ہندوستاں میں
دہکتے الاؤ تھے جنت نشاں میں
حکومت تھی غیروں کی محکوم ہم تھے
زمین تنگ تھی آسمانی ستم تھے
چلی پھر جو بدلاؤ کی تیز آندھی
اٹھا ایک نہرو اٹھا ایک گاندھی

ملی ان کو جو کامرانی سناؤ
کہانی سناؤ کہانی سناؤ

کہانی انوکھی کہانی نرالی
کہانی نئے ایٹمی دور والی
ستاروں کو انساں کا تسخیر کرنا
خلاؤں کو دھرتی کی جاگیر کرنا
سناؤ ترقی نے کیا کیا دکھایا
بتاؤ جو قدموں تلے چاند آیا
کرشمے جو سائنس کے جلوہ گر ہیں
ہمارے تمہارے جو زیرِ اثر ہیں

حقیقت یہ سب منہ زبانی سناؤ
کہانی سناؤ کہانی سناؤ
کہانی نئی یا پرانی سناؤ

♦ حیدر بیابانی، بسیرہ، اچل پورہ شہر، ضلع امراوتی۔ 444806 مہاراشٹر

پھونک
کہانی: نور شاہ
کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ
ایک لکڑ ہارا روز جنگل جا کر لکڑیاں کاٹتا اور شہر جا کر بیچا کرتا تھا۔ ایک دن سوکھی لکڑیوں کی تلاش میں دور چلا گیا۔ سردی کا موسم تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے۔ انگلیاں سن ہو جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کلھاڑی رکھ دیتا اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر پھونک مارتا تاکہ گرم ہو جائیں
فوں فو...فوں فو
دور ایک بالشتیا یہ سب دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا
یہ لکڑ ہارا ہاتھ میں پھونک کیوں مار رہا ہے
جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ ڈرتا ڈرتا لکڑ ہارے کے پاس پہنچا لکڑ ہارا اس کا قد دیکھ کر حیران رہ گیا
اتنا چھوٹا سا آدمی!؟
سلام بھائی لکڑ ہارے! اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھیں
بالشت بھر کا آدمی دیکھ کر لکڑ ہارا حیران بھی تھا اور ہنس بھی رہا تھا، کسی طرح اس نے ہنسی روکی
ہاں ہاں ضرور پوچھو...
میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم ہاتھوں میں پھونک کیوں مار رہے تھے
سردی بہت ہے، ہاتھ ٹھٹھر جاتے ہیں تو منہ سے پھونک مار لیتا ہوں، پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں تو پھر پھونک لیتا ہوں
یہ سن کر بالشتیا سوچ میں پڑ گیا ہوا سے گرمی کیسے آتی ہے؟ وہ وہاں سے چل دیا اور چھپ کر دیکھنے لگا

◆ نور شاہ 14 لال ڈیر کالونی گوری پور لنک روڈ راول پور سری نگر۔19005

ماں کے آنسو
کہانی: نور شاہ
کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ
ایک لڑکا تھا۔ نام تھا کلوا۔ اس کی عادت تھی جب کسی کو کام کرتے دیکھتا تو کہتا۔ میں بھی یہی کروں گا۔ ایک دن وہ گھر میں اکیلا تھا۔ ماں کھیت پر کام کرنے گئی تھی۔ گھر کے ایک کونے میں چابک پڑا تھا۔ اس نے چابک اٹھالیا۔
آہاہاہا... مزا آگیا...
باہر آکر وہ ایک پتھر کو چابک مارنے لگا...
چل اٹھ میرے گھوڑے چل اٹھ
نہ جانے کیا ہوا پتھر سچ مچ گھوڑا بن گیا
گھوڑا ذرا سا جھکا اور بولا:
آؤ میری پیٹھ کے اوپر بیٹھ جاؤ
واہ، بڑا مزا آئے گا
وہ گھوڑے پر بیٹھ گیا
بھئی واہ، اب کہاں لے جاؤ گے
جہاں تم چاہو... اب چلیں
اور گھوڑا کلوا کو لے کر چل دیا

لگام ٹھیک سے سنبھالو کلوا۔ گر گئے تو ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی
کلوا نے لگام کس کر پکڑ لی
اور گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا...
بڑا مزا آرہا ہے، واہ! اور تیز
گھوڑا ایک اونچے پہاڑ پر چڑھا اور دوسری طرف سے اتر کر ایک جنگل میں رک گیا۔ یہ عجیب جنگل تھا۔ اس کے پیڑ چھوٹے چھوٹے تھے اور وہاں سے گزرنا کافی مشکل تھا
اب آگے جانا مشکل نظر آتا ہے۔ اب اترو میاں کلوا...
واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو اور آگے جاؤں گا۔ چلو آگے چلو
کلوا اسے زور سے چابک مارنے لگا۔ گھوڑے کو غصہ آگیا اور وہ زور سے اچھل پڑا
میاں کلوا دھڑام سے گر گئے...

...اور پیدل ہی بھاگنے لگے
بھاگتے بھاگتے ایک سمندر کے نزدیک جا پہنچے۔
واہ، میں سمندر میں جاؤں گا... پانی میں جا کر مچھلیاں پکڑوں گا
یہ کہتے کہتے اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی
ایک سنہری مچھلی اس کی ٹانگوں کے بیچ آ کر ٹھہر گئی
آہا میں اس پر سواری کروں گا
سواری نہیں تم تیرو گے میرے ساتھ
اور پھر مچھلی نے ایسا گہرا غوطہ لیا کہ سمندر کی تہہ پر آ گئی، وہاں طرح طرح کی سیپیاں تھیں، وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا، مگر اس کا دم گھٹ رہا تھا
بس اب اوپر چلو... میرا دم گھٹتا ہے
وہ اب بڑی مشکل سے سانس لے پا رہا تھا
مچھلی اوپر آ گئی۔ لیکن ابھی کلوا نے سر پانی سے اوپر نکالا ہی تھا کہ ایک بڑا سا پرندہ وہاں آیا اور کلوا کو اپنی چونچ سے اٹھا لیا
ارے میرے تو پر نکل آئے۔ اب میں خوب اڑوں گا
نہیں۔ اب سونے کا وقت ہے
نہیں، میں نہیں سوؤں گا۔ اور اوپر جاؤں گا آسمان کے اندر
لیکن میں وہاں نہیں جا سکتا۔ تم جانا چاہتے ہو تو بادلوں کے ساتھ جاؤ
پرندے نے اپنا رخ موڑا۔ سامنے کچھ بادل اڑ رہے تھے

سید واجد علی شاہ، 12 فرسٹ فلور گلی نمبر 1 منڈاولی فاضل پور، دہلی-110092

نظم کہانی

یوسف انصاری

شطرنج کے مہرے

سناؤں تمہیں حالِ شاہِ سپہ کا
وہ شطرنج کی بازی جب ہار بیٹھا
شکایت تھی اس کو وزیر سپہ سے
ہوئی مات اس کو تھی جس کی وجہ سے
وہ کہنے لگا سخت ناراض ہوکر
کبھی میں نے کھائی نہیں ایسی ٹھوکر
مجھے ہار جانے کا جو دکھ ہوا ہے
سزا تم کو دوں یہ میرا فیصلہ ہے
کیا قید فرزیں کو زنداں میں فوراً
تہہ تیغ کرکے سپاہوں کو جبراً
وہ گھوڑے کو نخاس میں لے کے پہنچا
وہاں نعل بندی کے ماہر سے بولا
بہت سست رفتار ہے گھوڑا میرا
اسی نے ہے ہر کام میرا بگاڑا
اسے نعل پیروں میں باندھو شتابی
اس کی بدولت ہوئی ہے خرابی
مخاطب ہوا شاہ یوں سارباں سے
پکڑ اونٹ کی ایسے ہوتی کہاں سے

قدم جس کے بڑھتے رہے مثلِ طوفاں
کہیں بھی، کدھر بھی، یہ چلتا تھا ناداں
نکیل اس کے نتھنوں میں ڈالو برادر
اشارے پہ تاکہ چلے یہ برابر
جدل میں جو میں نے ہزیمت اٹھائی
اسی بھیدی نے میری لنکا ہے ڈھائی
کہا جاکے یوں شاہ نے فیل باں سے
چھڑا دو مجھے آفتِ ناگہاں سے
یہ مستی میں چلتا تھا مدہوش ہوکر
شرابی چلے جیسے ہوش اپنے کھوکر
مری جیت کو 'ہار' اس نے بنایا
کرو پاؤں زنجیر اس کے خدارا
خبر ہوگی دنیا کی باتوں کی تم کو
بتاتا ہوں میں بات لاکھوں کی تم کو
ملیں گے بہت سے تمہیں ایسے کم تر
جو اپنی خطا تھوپ دیں دوسروں پر
اگرچہ یہ دستورِ دنیا ہے بچو!
مگر تم کو دور اس سے رہنا ہے بچو

بچوں کے جرمن ادب سے

◆ ایم یوسف انصاری، 368 نیو وارڈ، مالے گاؤں۔423203 مہاراشٹر

مجیب شہزر

گھر میں آیا کمپیوٹر
چاند سا اجلا کمپیوٹر
اپنا پیارا کمپیوٹر
لگے ہمیں تو جادوگر
ایسا یہ کمپیوٹر ہے
دنیا جس کے اندر ہے

مت پوچھو کیا کیا دکھلائے
من چاہا پردے پر لائے
ماؤس کو تم ذرا ہلاؤ
منظر دیکھو خوش ہوجاؤ
دریا صحرا اور کہسار
اڑتی چڑیوں کی یہ قطار

لومڑی دیکھو گیدڑ بھی
کالی بڑی چمگادڑ بھی
جگنو جیسے جلے چراغ
یہ دیکھو آموں کے باغ
جو بھی چاہیں آپ جناب
پیش کرے یہ وہی کتاب
ہے جو اپنا کمپیوٹر
لائبریری بھی ہے سر
کمپیوٹر ہے وہ کالج
جس سے بڑھتی ہے نالج

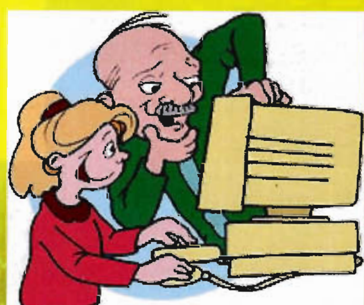

♦ ڈاکٹر مجیب شہزر، 9/9 ٹن ٹن باڑہ، کنکروالی گلی علی گڑھ۔ 202001

عابدہ محبوب

چکنی ہانڈی

کہانی کا نام پڑھتے ہی پہلے آپ ہنسیں گے۔ پھر شاید غصّہ آئے کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے 'چکنی ہانڈی'! لاحول ولاقوۃ۔ کہانی کا نام تو کچھ ایسا پیارا پیارا میٹھا میٹھا ہونا چاہیے کہ پڑھتے ہی منہ میں پانی بھر آئے۔ یا پھر ایسا خوفناک ہونا چاہیے کہ بس راتوں کی نیند حرام ہو جائے! میرے خیال میں اس کہانی کا نام 'چکنی ہانڈی' سے بہتر اور کوئی نہ ہوسکتا تھا۔ آپ خود کہانی پڑھ کر فیصلہ کرلیں۔ ویسے مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر آپ اس سے بہتر کوئی نام تجویز کریں۔ بہرحال...

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوچکی تھیں۔ امتحان کا بھوت کبھی کا سر سے اتر چکا تھا۔ ہم سب پاس بھی ہوگئے تھے، یہاں تک کہ آپا بھی (چاہے تھرڈ کلاس ہی سہی!) اب تو دن رات ہنگامے تھے۔ ان ہی دنوں میں ایک دن 'زلزلہ' آگیا۔ زلزلہ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی ماموں آئے ہیں۔ امّی کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بھائی۔ انتہائی شریر اور کھلنڈرے۔ چونکہ حج کے دن پیدا ہوئے تھے اس لیے بزرگ انھیں نام سے پکارنے کی بجائے 'حاجی' کہتے اور ہم سب حاجی ماموں! میرا دل تو انھیں پاجی ماموں پکارنا چاہتا، کیونکہ یہ جب بھی آتے آپا ان کی صحبت میں بگڑ کر اور 'شیر' ہوجاتیں اور دونوں مل کر مجھے ہر بات میں ستانے اور نیچا دکھانے کی تاک میں رہتے! ظاہر ہے مجھے ماموں کے آنے سے بالکل خوشی نہ ہوئی تھی مگر آپا کو تو گویا کوئی خزانہ مل گیا۔ اب تک تو ہنگامے گھر کی چار دیواری کے اندر ہی ہوتے تھے مگر ماموں کے آنے سے یہ پابندی ختم ہوگئی۔ کبھی پکنک، کبھی بوٹنگ، کبھی پکچر تو کبھی تالاب کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام! غرض آئے دن نت نئے پروگرام بنتے۔

ایک شام امی میرے بال گوندھتے گوندھتے تقریباً چلا اُٹھیں

''ہائے خدا، یہ جوئیں کہاں سے پڑ گئیں تمھارے سر میں۔''

''جوئیں؟'' میں نے پلٹ کر دیکھا تو واقعی کنگھی پر موٹی موٹی جوئیں

چل رہی تھیں۔ جس سر میں جوئیں ہوں اس کو بھلا کب امّی چھوڑنے والی تھیں وہ میرے سر کے سر ہوگئیں۔ مگر کم بخت جوئیں بھی ایسی بے غیرت تھیں کہ جانے کا نام نہ لیتی تھیں۔ آج امّی صاف کرتیں کل جوں کی توں موجود! آخر ایک دن امی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا ''یہ نحوست کہاں سے سر میں آگئی؟ میں تو تھک گئی۔ یہ سر کیسے صاف ہوگا۔''

''آپا جان! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہیں'' ماموں بولے ''سر آسانی سے صاف ہوجائے گا آپ حجام کو بلوائیے اور دو منٹ میں وہ...''

''ہاں امّی! ماموں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' آپا نے ماموں کی بات کاٹ کر کہا ''آپ حجام کو بلوا کر سر صاف کروا دیجیے ایسا نہ ہو کہ میرے سر میں پڑ جائیں!'' میں نے بالوں کی چلمن سے جھانک کر دیکھا آپا اور ماموں کے چہروں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ میں سمجھ گئی۔ اس بار 'حلیہ' بگاڑنے کی ٹھان لی ہے۔ اس سے پہلے کہ امّی کچھ جواب دیتیں میں جھٹ بول پڑی ''نہیں امّی! میں بال نہیں کٹواؤں گی۔ یہ آپا اور ماموں کی شرارت ہے! دونوں مل کر...''

''بس چپ رہو'' امّی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ''جیسے جیسے قد بڑھ رہا ہے ویسے ویسے زبان بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اپنی بہن اور ماموں کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے۔''

''چھوڑیے آپا جان۔'' ماموں نے کہا ''وہ ابھی بچی ہے اُسے اپنا اچھا بُرا کیا معلوم؟ اس کی فکر تو ہم کو کرنی چاہیے۔''

''وہی تو سوچتی ہوں'' امّی واقعی فکرمند ہوگئیں ''اب کیا کروں؟''

''آپ سوچنا چھوڑ دیں'' اس بار آپا نے کہا ''بس حجام کو بلوائیے اور سر صاف کرا دیجیے!''

''ہاں آپا جان! پانچ منٹ کی تو بات ہے۔'' ماموں نے حامی بھری ''اس کے بعد آپ کو آرام ہی آرام رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب ایسا ہی کرنا پڑے گا'' امّی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''سویرے بالیا حجام کو بلوا لو۔ یاد سے۔''

تقدیر کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ مگر تدبیر بھی تو کوئی چیز ہے۔ میں روتے جھینکتے بابا کے پاس گئی۔ بابا امّی کے پاس میری سفارش لے کر گئے۔ ''بھئی! یہ جوئیں مارنے کی دوا وغیرہ ملتی ہے۔ اس سے کام لو۔ غریب روتے روتے نڈھال ہو رہی ہے۔''

''مگر بھائی صاحب!'' امّی کے بجائے ماموں ٹپک پڑے ''بازاری دوائیں دماغ کو متاثر کر دیتی ہیں بال کمزور ہوجاتے ہیں اور اکثر تو بالکل نہیں آتے!''

''اچھا...'' بابا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''بھئی یہ تو ہمیں بالکل معلوم نہ تھا۔'' لیجیے! بابا بھی ساتھ چھوڑ گئے! لکھنے والے ہی نے میری تقدیر میں میرے بالوں کی بربادی لکھ دی تھی۔ کون پر مار سکتا تھا؟ اُس رات میں سو نہ سکی! بار بار بالیا حجام اور اس کا استرا آنکھوں میں گھوم جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آ گیا جبکہ میرا رونا دھونا سب بیکار گیا اور ماموں و شرفو نے پکڑ دھکڑ کر مجھے 'تختۂ دار' پر بٹھا دیا۔ 'پھانسی' لگنے سے پہلے میں نے 'دنیا' پر ایک نظر ڈالی! آپا نہ صرف خود بلاٹکٹ تماشا دیکھ رہی تھیں بلکہ پڑوس سے اپنی سہیلیوں کو بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ ''نہیں... چھوڑ دو مجھے۔ خدا کے واسطے چھوڑ دو... بابا... بابا۔'' میں چلاّ اُٹھی۔

''بس ایک منٹ۔ ابھی چھوڑ دیتے ہیں بھئی۔'' ماموں کہہ رہے تھے۔ ''ہاں بالیا وہی بات جو میں نے کہی تھی۔ جلدی...'' یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سر پر گدگدی کی ہو۔ دوسرے منٹ ماموں نے مجھے چھوڑ دیا موقع ملتے ہی میں بھاگ کھڑی ہوئی مگر آئینہ دیکھا تو حیران رہ گئی۔ چار انچ چوڑی مانگ پیشانی سے لے کر گردن تک چلی گئی تھی! گویا نہ اِدھر کے رہے تھے نہ اُدھر کے! جھک مار کر مجبوراً بالیا کے آگے سر جھکا دیا۔ جب ہوش آیا تو سامنے ایک کشن بال پڑے تھے۔ لانبے لانبے

سنہری بال۔!! کچھ ہنستی اور زیادہ روتی، کھڑی ہوتی تو آپا نے آئینہ ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک جھلک دیکھ کر آئینہ پھینک دیا (ڈر تھا رعبِ حُسن سے ٹوٹ نہ جائے!!) آئینہ تو نہ ٹوٹا ہاں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا!!

اب تو گھر اور باہر کے بڑوں و بچوں کے لیے میں تفریح کا نشانہ بن گئی۔ آپا (خدا سمجھے) اور حاجی ماموں (پاجی ماموں کہیں کا) کی تو بن آئی تھی۔ حاجی ماموں دھول جما کر کہتے ''بھئی آئینہ نہیں مل رہا۔ ذرا تم سامنے بیٹھ جاؤ... میں شیو بنالوں!''

کبھی کہتے ''میرا دل تو بس پھسلنے کو چاہ رہا ہے۔''

آپا اپنی سہیلی سے کہتیں! ''ممتاز! اس بار اپنے اسکول میں ایک نیا Globe آنے والا ہے جس پر ایک انوکھی ہی دنیا کا نقشہ ہوگا...'' پھر ایک دن میری اور آپا کی خوب چلی جب انھوں نے مجھے چڑانے کو کنگھا اور خوب صورت ربن لاکر دیے۔ ننھا منّو بھی میرا مذاق اُڑاتا ''چکنی ہانڈی گول گول، پیسہ دوں گا بول بول۔'' یہاں تک کہ شرفو (گدھا کہیں کا!) بھی چلا چلا کر امی سے پوچھتا ''بیگم صاحب! آج کیا پکے گا؟ شلغم، آلو یا گول کدّو؟ کس ہانڈی میں پکاؤں چکنی ہانڈی میں کہ کوری میں؟''

گھر پر کسی مہمان کا آنا مشکل۔ آپا فوراً انھیں بتا دیتیں ''جی وہ اس لیے آپ کے سامنے آنے سے شرما رہی ہیں کہ اُن کی چکنی ہانڈی کر دی گئی ہے۔'' مہمان شریف ہوتا تو خاموش رہ جاتا۔ اگر شریر ہوتا تو جب تک ہمارا 'دیدار' نہ کر لیتا اُسے چین نہ ملتا! ''خدایا! ایسی زندگی سے تو مر جانا بہتر ہے۔ تو مجھے موت دے دے۔'' میں نے اکثر دعائیں مانگیں مگر کہاں قبول ہوئیں؟

مارے شرم کے باہر نکلنا میں نے بند کر دیا تھا۔ مگر ایک دن جب چڑیا گھر جانے کا پروگرام بنا تو میرا دل بھی مچل گیا۔ ماموں بولے ''ارے بھئی! تم نہ چلنا۔ ہلکی بوندا باندی تو ہو ہی رہی ہے کہیں اولے بھی پڑنے لگے تو تمھارے سر کی خیر نہیں!''

''چڑیا گھر میں آئے ہوئے لوگ اگر تمھیں بھی کہیں کا ایک نمونہ سمجھ کر ہنسیں تو ہم سے کچھ نہ کہنا۔ کیوں ماموں!'' آپا بولیں۔

اب کون ایسا بے غیرت تھا جو ساتھ جاتا۔ میرے دل سے بددعا نکل گئی خدایا۔ تو ان سب سے... خصوصاً آپا سے اس کا بدلہ لے، اور خدا نے میری سن لی! بارش میں بھیگنے کی وجہ سے دبلی پتلی آپا کو بخار چڑھا اور کچھ ایسا چڑھا کہ ٹائیفائیڈ میں بدل گیا۔ امّی اور بابا پریشان۔ ماموں دن رات تیمارداری میں مصروف۔ دوست رشتے دار مزاج پرسی کے لیے چلے آرہے تھے۔ صرف میں تھی جس نے آپا کے کمرے کا رُخ تک نہ کیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل پتھر بن گیا تھا۔ ایک دن پتہ چلا کہ بخار نارمل ہو گیا پھر پتہ چلا کہ کمزوری کے باعث چل پھر نہیں سکتیں۔ پھر وہ دن بھی آیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ امّی ماموں سے کہہ رہی تھیں ''ٹائیفائیڈ کی وجہ سے بال کمزور ہو کر جھڑنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ کٹوا دو۔ تم بالیا کو بلا لاؤ۔ جلدی۔''

بالیا آیا اور اپنا کام کر کے چلا گیا! مگر میرا کام باقی تھا۔ ''اب بتاتی ہوں۔'' میں آپا کے کمرے کی طرف بھاگی! مگر جیسے ہی آپا پر نظر پڑی انتقام کی آگ سرد پڑ گئی۔ دُبلا پتلا جسم، زرد چہرہ، سوکھے ہونٹ، ناتواں سی آنکھیں۔ سر پر کالا کپڑا بندھا ہوا۔ یہ تھیں آپا جو تین تکیوں کا سہارا لیے بیٹھی تھیں! مجھے دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ''مجھے معاف کر دو۔ میری منّی بہن! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمھیں بہت ستایا۔ بہت تنگ کیا، مجھے اس کی سزا مل چکی!''

''ارے! ارے! یہ کیا کہتی ہو آپا'' میں دوڑ کر آپا سے لپٹ گئی۔

''ٹھیک کہتی ہوں۔ میں بہت بری ہوں۔ بہت۔''

'بس۔ بس۔ زیادہ باتیں نہ کرو آپا۔ ڈاکٹر صاحب نے منع کیا ہے۔'' میں نے اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں چاہتی تو آپا کو خوب جلی کٹی سنا سکتی تھی۔ خوب چڑا سکتی تھی۔ آپا کے آنسوؤں نے میرا دل صاف کر دیا تھا۔ میں نے اُنھیں معاف کر دیا۔ معاف کرنے ہی میں انسان کی بڑائی اور جیت ہے! □

ماہنامہ کھلونا نئی دہلی کے شمارہ اگست 1964 سے بشکریہ جناب فیروز بخت

انڈے ، مولی اور گاجر

ایک بے وقوف (دوسرے سے): بتاؤ میری جھولی میں کیا ہے؟ اگر تم بتادو تو انڈے تمھارے۔ اور اگر یہ بتادو کہ کتنے ہیں تو چاروں انڈے تمھارے

دوسرا بے وقوف: بھائی میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں۔ کچھ اتہ پتہ بتاؤ۔

پہلا بے وقوف: یوں سمجھ لو کہ سفید سفید چیز میں زرد زرد چیز بند ہے۔

دوسرا بے وقوف: سمجھ گیا۔ مولی کے اندر گاجر بند ہے۔

میں کروڑ پتی ہوں

استاد نے بچوں کو مضمون لکھنے کو کہا، ''اگر میں کروڑ پتی ہوتا!''

سب لڑکے مضمون لکھنے لگے۔ لیکن ایک لڑکے نے کچھ نہیں لکھا۔ صرف سوچتا رہا۔ استاد نے پوچھا، ''کیا بات ہے؟ تم نے لکھنا شروع نہیں کیا ابھی تک سوچ ہی رہے ہو؟''

''جی نہیں سر۔ میں سوچ نہیں رہا۔ ذرا اپنی سیکریٹری کا انتظار کر رہا ہوں تا کہ اسے مضمون لکھنے کے لیے کہہ سکوں!'' لڑکے نے کہا۔

دادا کی شادی

ایک بچّے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھٹّی کے لیے کیا بہانہ بنائے۔ آخر اس نے استاد کو درخواست لکھی کہ مجھے اپنے دادا کی شادی کے لیے چھٹّی چاہیے۔

استاد نے پوچھا، ''وہ اس عمر میں شادی کیوں کر رہے ہیں؟''

لڑکے نے کہا، ''وہ خود شادی نہیں کر رہے ہیں۔ میں زبردستی کروا رہا ہوں۔''

ایک اور آئس کریم

''بیٹے ایک اور آئس کریم کھاؤ گے؟'' کنجوس باپ نے پوچھا۔

''لیکن ابّو میں نے تو ایک آئس کریم بھی نہیں کھائی!''

''تم بھول رہے ہو بیٹا! پچھلے سال ہم یہاں آئے تھے تو کیا ایک آئس کریم نہیں کھائی تھی؟''

فقیر کی گرل فرینڈ

فقیر: 10 روپے دے دو بابا، چائے پیوں گا!

راہگیر: مگر چائے تو پانچ روپے کی آتی ہے!

فقیر: گرل فرینڈ بھی پیے گی...

راہگیر: فقیر نے بھی گرل فرینڈ بنالی

فقیر: نہیں بابا، گرل فرینڈ نے فقیر بنا دیا!

جن کی چیخیں

شادی کی تقریب میں جن آ گیا۔ جن کو دیکھتے ہی لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک بابا جی نے لڑکیوں سے وضو کرنے کو کہا۔

میک اپ تھوپی ہوئی لڑکیوں نے وضو کیا اور واپس آئیں تو...

جن کی چیخیں نکل گئیں!

روٹی کا سوال

ٹیچر: 2 میں سے 2 نکلے تو کیا بچا؟

ایک لڑکا: سوال سمجھ میں نہیں آیا جناب۔

ٹیچر: مان لو تمھارے پاس دو روٹیاں تھیں۔ وہ تم نے کھالیں تو کیا بچا؟

لڑکا: سالن...

ایک گھنٹہ پہلے

ڈاکٹر: ایک گھنٹہ پہلے لے آتے تو ہم اسے بچا سکتے تھے

رشتہ دار: کیسے ڈاکٹر ہو تم؟ ایک گھنٹہ پہلے کیسے لے آتے! اس کا ایکسیڈنٹ پندرہ منٹ پہلے ہوا ہے!

کتنے بر اعظم؟

ٹیچر: یہ بتاؤ دنیا میں کتنے براعظم ہیں؟

اسٹوڈنٹ: سر دنیا میں چار براعظم ہیں۔

ٹیچر: نام بتاؤ

اسٹوڈنٹ: ہندوستان میں مغل اعظم۔ پاکستان میں قائداعظم۔ یونان میں سکندراعظم۔ اور ہمارے گاؤں میں میرے چچا حاجی اعظم۔

پڑھا لکھا گھرانہ

باپ: میرے چار بچے ہیں۔ ایک نے ایم بی اے کیا ہے۔ دوسرا ایم اے کر چکا ہے۔ تیسرا پی ایچ ڈی ہے۔ اور چوتھا چوریاں کرتا ہے۔

دوست: اوہ، تو چوتھے کو گھر سے کیوں نہیں نکال دیتے۔ اتنے پڑھے لکھے گھر میں ایک چور کا کیا کام؟

باپ: اکیلا وہی تو کماتا ہے جس سے گھر چل رہا ہے۔ باقی سب بے روزگار ہیں۔

چاند اور جھانسہ

نیل آرم اسٹرانگ نے جب پہلی مرتبہ چاند پر قدم رکھا تو خوشی سے پھولا نہ سمایا کہ وہ پہلا انسان ہے جو چاند پر آیا ہے۔ تبھی اس کی نظر وہاں پہلے سے موجود شخص پر پڑی جو اپنے اٹیچی کیس اور باقی سامان کے ساتھ وہاں بیٹھا رو رہا تھا۔ نیل آرم اسٹرانگ نے پوچھا، تم کون ہو؟ اس شخص نے روتے ہوئے جواب دیا: ''میں ایک ہندوستانی ہوں اور ایک ایجنٹ مجھے امریکہ بھیجنے کا جھانسہ دے کر یہاں چھوڑ گیا ہے۔'' □

کسی نے یہ لطیفے نانی کے صندوق سے چوری کر کے انٹرنیٹ پر ڈال دیے تھے، مگر ہم انھیں وہاں سے تمھارے لیے واپس لے آئے

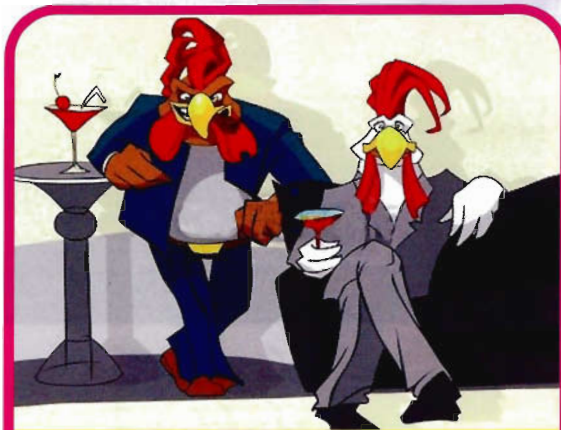

ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے

ٹوٹ بٹوٹ کے دو مرغے تھے دونوں تھے ہشیار
اک مرغے کا نام تھا گیٹو اک کا نام گٹار

اک مرغے کی دم تھی کالی اک مرغے کی لال
اک مرغے کی چونچ نرالی ک مرغے کی چال

ایک پہنے پتلون اور نیکر اک پہنے شلوار
اک پہنے انگریزی ٹوپی اک پہنے دستار

اک کھاتا تھا کیک اور بسکٹ اک کھاتا تھا نان
ایک چباتا لونگ سپاری ایک چباتا پان

دونو اک دن شہر کو نکلے لے کر آنے چار
پہلے دریا گنج وہ پہنچے پھر مینا بازار

اک ہوٹل میں انڈے کھائے اک ہوٹل میں پائے
اک ہوٹل میں سوڈا واٹر اک ہوٹل میں چائے

پیٹ میں جب روٹی اتری تب دونوں ہوش میں آئے

تخلیق کار: نامعلوم

جسپال کور

صبح سویرے

صبح سویرے جاگو سارے
قدرت کے رنگ دیکھ لو پیارے
چڑھ گیا سورج ہوا اجالا
سو گئے سارے چاند ستارے
تو بھی اٹھ جا سونے والے
کر لے اپنے کام تو سارے
باغوں میں بھی چہل پہل ہے
کتنی رونق کتنے نظارے
کتنے سارے کتنے کومل
پھول کھلے ہیں نیارے نیارے
کتنے سندر رنگ برنگے
اڑتے پنچھی پیارے پیارے
سونے والو اب تو جاگو
اٹھ کر دیکھو تم یہ نظارے

جسپال کور، 414 -WZ، سیکنڈ فلور، نانک پورہ ہری نگر، نئی دہلی۔110064

راشد حسین راہی

ترنگا

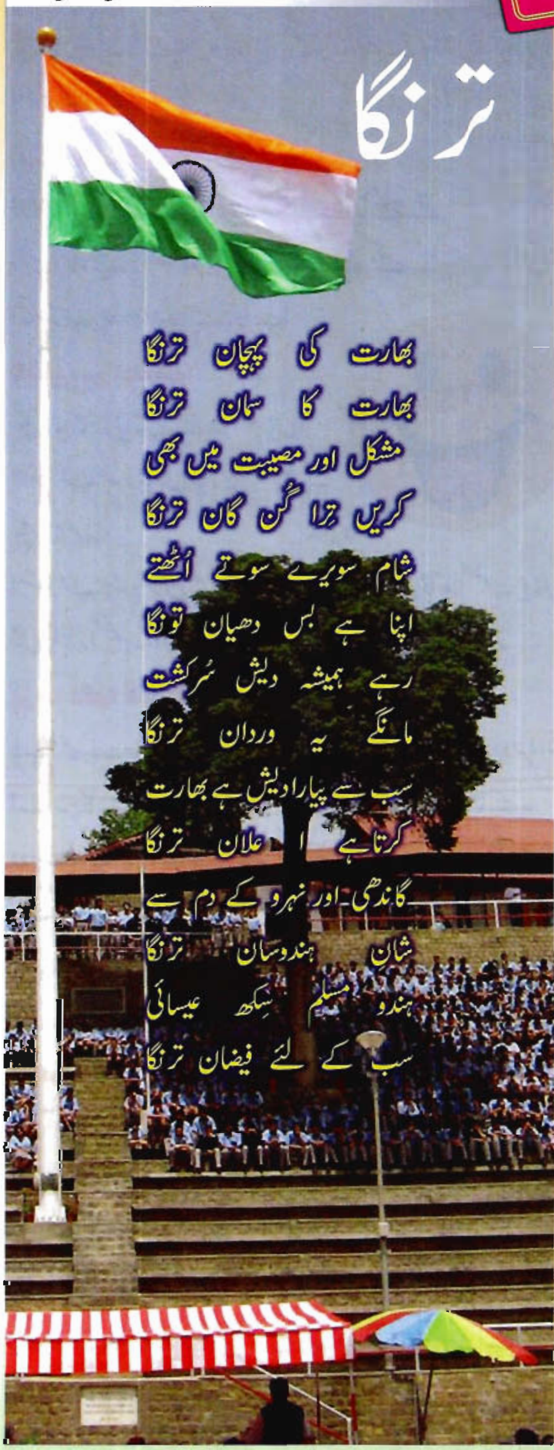

بھارت کی پہچان ترنگا
بھارت کا سمان ترنگا
مشکل اور مصیبت میں بھی
کریں ترا گُن گان ترنگا
شام سویرے سوتے اُٹھتے
اپنا ہے بس دھیان ترنگا
رہے ہمیشہ دیش سُرکشت
مانگے یہ وردان ترنگا
سب سے پیارا دیش ہے بھارت
کرتا ہے اعلان ترنگا
گاندھی اور نہرو کے دم سے
شانِ ہندوستان ترنگا
ہندو مسلم سِکھ عیسائی
سب کے لئے فیضان ترنگا

راشد حسین راہی، ایمن زئی، جلال نگر، شاہجہاں پور، یوپی۔242001

ادارہ

شمسی سال کا نواں مہینہ ستمبر دراصل رومن کلینڈر کا ساتواں مہینہ ہے جو حضرت عیسیٰ سے 46 سال پہلے رائج تھا۔اطالوی زبان میں سپتم Septem کا مطلب ہے سات یا ساتواں۔سنسکرت میں بھی سپتم کو سات کہتے ہیں۔فارسی میں لفظ ہفتم اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے اور اردو کا سات بھی اسی طرح بنا ہے۔ بعد میں جولین اور گریگورین کلینڈر میں ستمبر نوویں مقام پر چلا گیا کیونکہ اس میں یکم مارچ کی بجائے پہلی جنوری کو سال کا پہلا دن بنا دیا گیا تھا۔زمین کے گولے کا جو شمالی حصہ ہے اس میں ستمبر خزاں کا پہلا مہینہ ہے جب کہ جنوبی حصے میں اس سے موسم بہار کی شروعات ہوتی ہے۔ہندوستان کے شمالی علاقوں میں اس مہینے میں بلا کی اُمس پڑتی ہے جس کی وجہ سے کئی لوگ اردو میں ستمبر کو 'ستم گر' بھی کہتے ہیں۔ سال کے چاروں آخری مہینوں ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے نام کسی بادشاہ یا دیوی دیوتا کے نام سے جڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہندسوں سے بنے ہیں۔ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ ستمبر سے شروع ہونے والے آٹھوں مہینوں کے ناموں میں اردو کا حرف 'ر' یا انگریزی کا R ضرور شامل ہے۔ باقی چار مہینوں مئی، جون، جولائی اور اگست کے ناموں میں 'ر' کی آواز نہیں ہوتی۔اور اس سے بھی دل چسپ بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان چاروں مہینوں میں مچھلی بالکل نہیں کھاتے۔ان کا خیال ہے کہ ان مہینوں میں مچھلیاں اپنی نسل بڑھاتی ہیں اور ان میں انڈے بھرے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں کھانا آدمی کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔دنیا میں مچھلیوں کی ہزار قسمیں ہیں جو سال بھر انڈے دیتی رہتی ہیں اور انڈے والی مچھلیوں کو بھون کر یا تل کر کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ چلیے، مچھلیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر یہ دیکھتے ہیں کہ ستمبر میں کون سے اہم تاریخی واقعات ہوئے ہیں۔

یکم ستمبر: 1534 میں سکھوں کے چوتھے گرو، گرو رام داس کی وفات ہوئی۔روس کے شہنشاہ، پیٹر دی گریٹ نے 1689 میں داڑھی رکھنے پر ٹیکس لگا دیا۔انگلینڈ نے 1798 میں حیدرآباد کے نظام سے ایک دوسرے کی حفاظت کا معاہدہ کیا۔ 1859 میں سورج پر اٹھنے والے زبردست طوفان نے زمین پر ٹیلی گراف سروس ٹھپ کر دی۔ جاپان نے 1945 میں ہتھیار ڈال کر دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ کردیا۔ 1962 میں اقوام متحدہ نے اعلان کیا کہ زمین پر انسانوں کی آبادی 3 ارب ہوچکی ہے (آج یہ 7 ارب سے آگے نکل چکی ہے)۔ 1965 میں اس روز ہندوستان پاکستان میں سرحد پر جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ 1969 میں انقلابی لیڈر کرنل معمر قذافی نے لیبیا کے بادشاہ کو تخت

گرو رام داس جی

1859 کے سپر سولر اسٹارم کی پینٹنگ

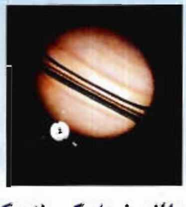

پائنیر زحل کے نزدیک

سے اتار کر حکومت ہاتھ میں لے لی۔ امریکی خلائی جہاز پائنیر Pioneer 11 نے 1979 میں سیارہ زحل Saturn کے قریب سے اڑان کی اور اس سیارے کے ایک نئے چاند اور حلقوں Rings کا پتہ لگایا۔

2 ستمبر: 490 قبل مسیح کو اس دن فڈی پڈیز Phedipidies کی وفات ہوئی جس کی یاد میں آج تقریباً اسی فاصلے کی میراتھن دوڑ اولمپک اور دوسرے کھیل مقابلوں میں ہوتی ہے جسے دوڑ کر طے کرنے کے بعد اس نے اپنی جان دی تھی اور یونان کو ایک اہم خبر وقت پر پہنچا کر جنگ ہارنے سے بچایا تھا۔ 1666 میں صبح سویرے 2 بجے (رات) وہ بھیانک آگ شروع ہوئی جس سے لندن کا 80 فیصد علاقہ تباہ ہو گیا لیکن صرف 6 جانیں گئیں۔ 1898 کو پہلی بار مشین کا استعمال امریکہ میں شروع ہوا۔ 1902 میں پہلی سائنس فکشن فلم 'اے ٹرپ ٹو دی مون' (چاند کا سفر) ریلیز ہوئی۔ 1930 میں یوروپ سے امریکہ ہوائی سفر پہلی بار بیچ میں رکے بغیر طے کیا گیا جس میں 37 گھنٹے لگے۔ 1946 میں پنڈت جواہر لال نہرو نے پہلی بار حکومت قائم کی۔

لندن کی آگ : ایک پینٹنگ

سائنسی فلم کا پوسٹر

3 اگست: 1969 میں ویت نام کے عظیم انقلابی رہنما اور شمالی کوریا کے صدر ہو چی منہ (نگوئین تات تنھ) کا انتقال ہوا جن کے نام کا مطلب ہے 'روشنی کا مینار'۔ 1752 میں اس روز اُن 11 دنوں کی شروعات ہوئی جنھیں انگلینڈ کی حکومت نے گریگورین کیلنڈر کو اپناتے ہوئے پرانے کیلنڈر سے ہٹا دیا تھا اور اسے 3 کی بجائے 13 ستمبر کا دن قرار دیا

خلائی جہاز وائکنگ سے ملنے والی مریخ کی ایک پہلی تصویر

تھا۔ اس پر لوگوں نے بلوے شروع کر دیے اور حکومت پر الزام لگایا کہ وہ ان کی زندگی کے 11 دن کھا گئی ہے۔ اگلے روز امریکہ میں بھی یہی کیلنڈر لاگو ہو گیا۔ 1939 میں برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ پر قبضے کی مخالفت کرتے ہوئے جرمنی سے جنگ چھیڑ دی۔ 6 گھنٹے بعد آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کینیڈا بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔ 1949 میں چین کے چیانگ کنگ شہر میں آگ لگنے سے 7 ہزار لوگوں کی موت ہو گئی۔ 1967 میں سویڈن میں دائیں ہاتھ پر گاڑی چلانے Right Hand Drive کا رواج شروع ہو گیا۔ امریکی خلائی جہاز وائیکنگ 2 نے سیارہ مریخ Mars پر 1976 میں اتر کر تصویریں بھیجنا شروع کیں۔

4 ستمبر: دنیا میں پہلی بار 1882 میں کسی شہر (پرل اسٹریٹ، نیویارک، امریکہ) کو بجلی سے روشن کیا گیا۔ 1825 میں دادا بھائی نوروجی کی پیدائش ہوئی جو برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی ممبر تھے۔

5 ستمبر: ہندوستان کے سابق صدر اور عظیم فلسفی سروپلی ڈاکٹر رادھا کرشنن 1888 میں پیدا ہوئے۔ 1986 میں پین امریکن ہوائی جہاز کو اغوا کرنے والوں نے کراچی پاکستان کے ہوائی اڈے پر 21 لوگوں کو مار ڈالا۔ 1972 میں فلسطینی دہشت گردوں نے میونخ، جرمنی کے اولمپک گاؤں میں اسرائیل کے 11 کھلاڑیوں کو مار ڈالا۔ 1980 میں سوئٹزر لینڈ کے

ڈاکٹر رادھا کرشن

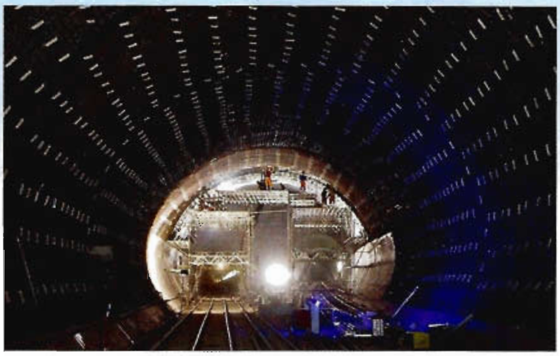

سوئٹزر لینڈ میں دنیا کی سب سے لمبی ریل موٹر سرنگ

آلپس Alps پہاڑوں کے نیچے بنائی گئی دنیا کی سب سے لمبی موٹر گاڑیوں کی سرنگ کو کھول دیا گیا جو اب 35 میل لمبی دنیا سب سے لمبی ریل سرنگ بن گئی ہے۔

6 ستمبر: عظیم جاپانی فلم ڈائریکٹر اکیرا کروساوا کا 1998 میں انتقال ہوا۔ 1909 میں اس روز خبر ملی کہ ایڈمرل پیئیرے Adml Peary نے پانچ ماہ پہلے قطب شمالی کا پتہ لگا لیا تھا۔ 1965 میں ہندوستان اور پاکستان میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی اور ہندوستانی فوج لاہور کی سرحد پر پہنچ گئی۔ 1992 میں نورالدین مرسلی نے 1500 میٹر کی دوڑ 3 منٹ اور 28.86 سیکنڈ میں مکمل کر کے ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔ 1997 میں برطانیہ کی شہزادی ڈائنا کی آخری رسوم کو دنیا میں کروڑوں لوگوں نے ٹی وی پر دیکھا۔ ڈائنا کی چند روز قبل سڑک حادثہ میں موت ہوگئی تھی۔

اکیرا کروساوا

نورالدین مرسلی

7 ستمبر: 1552 میں سکھوں کے دوسرے گرو، گرو انگد دیو جی کی وفات ہوئی۔ انگریزی کے بیسٹ سیلر ناول 'شوگن' کے مصنف جیمس کلیول James Clavel کا 69 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ 1251 قبل مسیح میں اس روز ایک سورج گرہن ہوا جسے طاقت کے دیوتا ہراکلز Heracles یا ہرکیولس Hercules کی پیدائش کی نشانی مانا جاتا ہے۔

8 ستمبر: 1943 میں اٹلی نے اتحادی فوجوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ چینی فوجیوں نے 1962 میں ہندوستان تبت سرحد پر میک میہون لائن Mac Mahon Line کو پار لیا اور ہندوستان میں آ گھسے۔

لیو ٹالسٹائی

9 ستمبر: 1828 میں روسی مصنف لیو ٹالسٹائی کی پیدائش جنھوں نے وار اینڈ پیس War and Peace اور انا کرینینا Anna Karenina جیسے ناول دنیا کو دیے۔ 1850 میں ہندی کے شاعر ڈرامہ نویس اور جدید ہندی نثر کے پہلے ادیب بھارتیندو ہریش چندر پیدا ہوئے۔ 1890 میں کے ایف سی یا کینٹکی فرائڈ چکن کے نام سے دنیا کی سب سے بڑی تلا ہوا مرغ بنانے والی کمپنی کے بانی ہارلے سانڈرس امریکہ میں پیدا ہوئے۔ 1976 میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ ماؤ تزے تنگ کا 82 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ 1993 میں پی ایل او نے اسرائیل کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ایک الگ ملک مان لیا۔

بھارتیندو ہریش چندر

11 ستمبر: 1948 میں پاکستان کے قائداعظم اور پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح 71 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ 1971 میں روس کے سابق حکمراں نکیتا خروشچیف Nikita Khrushchev نے 77 سال کی عمر میں وفات پائی۔ مہاتما گاندھی نے 1906 میں اس روز جنوبی افریقہ میں عدم تشدد پر مبنی تحریک کو 'ستیہ گرہ' کا نام دے کر جدوجہد کی سیاست کو ایک نیا لفظ دیا۔ 1930

نکیتا خروشچیف افام متحدہ میں امریکہ کو جوتا دکھاتے ہوئے۔

نیویارک کی دو بلندترین عمارتوں پر دہشت گردوں کا حملہ

میں جاسوسی ناول لکھنے والی دنیا کی مشہور ترین مصنفہ اگا تھا کرسٹی Agatha Christie نے 39 سال کی عمر میں 26 سال کے آرکیا لوجسٹ میکس میلوون سے شادی کی۔ 1973 میں چلی کی فوج نے صدر سیلواڈور النڈے کو قتل کرکے ظالم ڈکٹیٹر جنرل پنوشے کو ملک کی باگ ڈور سونپ دی۔ 2001 میں دہشت گردوں کے اغوا کیے ہوئے دو ہوائی جہاز، امریکہ میں نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دو بلند عمارتوں سے جا ٹکرائے جس سے یہ عمارتیں دھنس کر ڈھے گئیں اور 2752 لوگوں کی موت ہوگئی۔ایک تیسرا ہوائی جہاز دہشت گردوں نے مسافروں سمیت واشنگٹن میں امریکی فوجی ہیڈکوارٹرز پینٹا گان کی عمارت سے ٹکرا دیا جس سے 125 لوگ ہلاک ہوگئے۔اسی روز اغوا کیے گئے چوتھے ہوائی جہاز کے اسٹاف اور مسافروں نے دہشت گردوں پر قابو پانے کی کوشش کی جس کے دوران جہاز پین سلوانیا میں تباہ ہوگیا اور جہاز پر موجود تمام 64 لوگ مارے گئے جن میں اغوا کار بھی شامل تھے۔

12 ستمبر: 1948 ہندوستانی مسلح پولیس نے حیدرا باد میں داخل ہوکر ریاست حیدراباد کے حکمراں میر عثمان علی کو اقتدار سے ہٹا دیا۔

14 ستمبر: 786 میں اپنے بھائی الہادی کے انتقال کے بعد ہارون رشید عباسی خلیفہ بنے۔1812 میں نپولین نے ماسکو پر قبضہ کرلیا اور شہر میں آگ لگنے کی وارداتیں شروع ہوگئیں جو 19 ستمبر کو رکیں مگر تب تک ماسکو کے 90 فیصد مکان اور ایک ہزار چرچ جل کر خاک ہو گئے۔ 1953 میں نکیتا خروشچیف کو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا فرسٹ سیکریٹری مقرر کیا گیا جو مملکت کا سب سے بڑا عہدہ تھا۔ 1960 میں عراق ، ایران، کویت، سعودی عرب اور وینیز ویلا نے پٹرولیم برامد کرنے والے ملکوں کی تنظیم قایم کی جسے Organization of Petroleum Exporting Countries یا OPEC کہتے ہیں۔

خلیفہ ہارون رشید

15 ستمبر: 973 میں فزکس، میتھ ، طب ، تاریخ اور سیاروں سے متعلق علوم کے ماہر عظیم فلسفی البیرونی پیدا ہوئے۔اٹلی کے مشہور سیاح Traveller کا 1254 میں جنم ہوا جس کے ایشیائی سفروں کی کتاب نے یوروپ والوں کو سینٹرل ایشیا اور چین سے تجارت کی طرف توجہ دلائی۔ 1890 میں اگا تھا کرسٹی، ڈیون شہر میں پیدا ہوئیں۔ 2012 میں جاپان نے اعلان کیا کہ وہ 2030 تک ایٹمی طاقت سے چلنے والے تمام بجلی گھر اور دوسرے یونٹ بند کردے گا۔

البیرونی

17 ستمبر: عربوں نے 642 میں اسکندریہ (مصر) کو فتح کیا جسے انگریزی میں Alexandria کہتے ہیں۔ 1598 میں ہالینڈ کے جہاز رانوں نے بحر ہند میں ماریشس Mauritius کا پتہ لگایا۔ 2004 میں تمل زبان کو ہندوستان کی پہلی کلاسیکی زبان قرار دیا گیا۔

18 ستمبر: 1502 میں کرسٹوفر کولمبس نے اپنے چوتھے اور آخری سمندری سفر میں کوسٹاریکا Costa Rica کی زمین پر قدم رکھا۔ 2009 میں 72 سال تک چلنے والے امریکی ریڈیو ٹیلی ویژن سیریل گائڈنگ لائٹ کا آخری 15762 واں اپی سوڈ نشر ہوا جو 25 جنوری 1937 سے ریڈیو پر شروع ہوا تھا۔ مشہور اداکارہ گریٹا گاربو سویڈن میں 1905 میں پیدا ہوئیں۔ ہندوستانی اداکارہ شبانہ اعظمی کا جنم 1950 میں ہوا۔

20 ستمبر: پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ اور ان کے رفیق حضرت ابوبکر صدیق اسی روز 622 میں مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے جو اسلام کی تاریخ کا بہت اہم واقعہ تھا اور اسی سے اسلامی ہجری کیلنڈر شروع ہوتا ہے۔ 1187 میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم کا محاصرہ (گھیراؤ) شروع کیا۔ 1932 میں مہاتما گاندھی نے ہندوؤں میں چھوت چھات کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کی۔ 1934 میں مشہور اداکارہ صوفیہ لارین روم میں پیدا ہوئیں۔

مسجد نبوی، جو اسی جگہ واقع ہے جہاں پیغمبر اسلام نے ہجرت کے بعد قیام فرمایا تھا

21 ستمبر: جرمن فلسفی آرتھر شوپن ہار Schopenhauer Arthur کا 1860 میں انتقال ہوا۔ اسپین کی فاشسٹ حکومت نے جنرل فرانکو کو ملک کا سپریم کمانڈر اور ڈکٹیٹر مقرر کیا۔ 1866 میں ایچ جی ویلز پیدا ہوئے جو انگریزی کے بہت اہم مصنفوں میں گنے جاتے ہیں۔

22 ستمبر: جنوبی افریقہ کی زولو قوم کے عظیم لیکن بے رحم بادشاہ شاکا کو اس کے بھائیوں نے 1828 میں قتل کرا دیا۔ 1965 میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بند ہوگئی۔ 1972 میں یوگانڈا کے ڈکٹیٹر عیدی امین نے 8000 ایشیائیوں کو ملک سے نکال دیا۔ 1973 میں ہنری کسنگر امریکہ کے پہلے یہودی وزیر خارجہ بنے۔ 1986 میں مدراس (چینئی) میں ہندوستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان ہونے والا ٹیسٹ میچ برابری کے اسکور پر ختم ہوگیا۔

23 ستمبر: 1939 میں نفسیاتی جائزہ کے موجد فلسفی سگمنڈ فرائڈ کا انتقال ہوا۔ 1939 میں نیویارک میں ایک ٹائم کیپسول زمین میں دفن کیا گیا جس میں ایک زنانہ ہیٹ اور مردانہ پائپ کے ساتھ 1100 مائکرو فلمیں رکھی گئی تھیں۔ ایسے ٹائم کیپسول آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیے جاتے رہتے ہیں تاکہ دنیا کی تباہی یا نئے سرے سے آباد ہونے کی صورت میں اس وقت کے لوگوں آج کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائے۔ 1939 کا کیپسول 6939 میں یعنی تدفین کے ٹھیک پانچ ہزار سال بعد کھولے جانے کے خیال سے دفن کیا گیا۔ 2012 میں ایران نے گوگل سرچ انجن کے استعمال پر پابندی لگادی۔

24 ستمبر: 1534 میں چوتھے سکھ گرو، گرو رام داس کا جنم ہوا۔ 1853 میں کارنیلیس وانڈربلٹ Cornelius Vanderbilt نے دنیا میں پہلی بار بادبانی کشتی (جو ہوا کے زور سے چلتی ہے) سے زمین کے گولے کا پورا چکر لگایا۔ 1950 میں کرکٹ کھلاڑی مہندر امرناتھ کی پیدائش ہوئی۔

26 ستمبر: 1820 کو بنگالی نثر کے عظیم مصنف اور ادیب ایشور چندر ودیا ساگر کی پیدائش ہوئی۔

27 ستمبر: مشہور گلوکار مہندر کپور کا 2008 میں انتقال ہوا۔

28 ستمبر: 1970 میں جمال الدین ناصر کے انتقال کے بعد انور سادات نے مصر کے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ آسٹریلیا سے باہر سب سے پہلا دن رات کا ون ڈے انٹرنیشنل کرکٹ میچ نئی دہلی میں ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان 1984 میں کھیلا گیا۔ 551 قبل مسیح کو عظیم فلسفی اور مذہبی رہنما کنفیوشس کی پیدائش ہوئی۔ 1929 میں لتا منگیشکر پیدا ہوئیں۔

لتا منگیشکر

29 ستمبر: 2009 سموآن جزیروں کے نزدیک درجہ 8 کی طاقت کا زبردست زلزلہ آیا جس سے سمندر میں ہونے والی ہلچل نے وہ تباہ کن اونچی لہریں پیدا کیں جنھیں سونامی Tsunami کہتے ہیں۔

30 ستمبر: 1993 میں 6.4 طاقت کے زلزلے نے لاتور میں 28000 لوگوں کی جان لے لی۔ 1207 میں فارسی کے عظیم صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی کی پیدائش ہوئی۔ 1962 میں ہندوستانی گلوکار رشان پیدا ہوئے۔ □

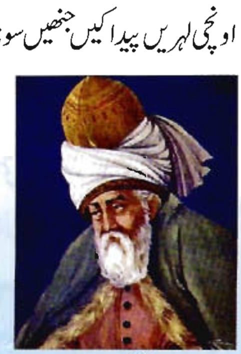

مولانا رومی

آپ کے سوال

ڈاکٹر بقراط کے جواب

ڈاکٹر بقراط عجیب شخصیت کے مالک ہیں۔کوئی ایسا سوال نہیں جس کا جواب ان کے پاس نہ ہو۔مشکل بس یہ ہے کہ ان کے دماغ کی زنبیل میں جواب تو بہت سے ہیں، لیکن سوالوں سے ان کا ذہن خالی ہو گیا ہے۔ بچوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس پوچھنے کے لیے ہمیشہ بہت سے سوال رہتے ہیں۔ یہ کیا ہے، وہ کیوں ہے، یہ کیوں نہیں ہے، وہ کس لیے ہے، کس کے لیے ہے...یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب ملنے سے نئے سوال سامنے آتے ہیں، اور یوں سوالوں کے ساتھ ساتھ آپ کے علم و معلومات میں اضافے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بقراط آپ کے سوالوں کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے بات کریں گے میاں افلاطون جو ایک مشہور طالب علم ہیں اور ایک ہی کلاس میں لگاتار فیل ہونے کا عالمی ریکارڈ بنانے والے ہیں!

میاں افلاطون: آداب عرض ہے ڈاکٹر صاحب۔ سب سے پہلے یہ بتائیے کہ دنیا میں مرغی پہلے آئی یا انڈا؟

ڈاکٹر بقراط: میاں سانس تو لے لو۔ ابھی آ کر بیٹھے بھی نہیں اور آتے ہی اتنا مشکل سوال داغ دیا۔ پہلے یہ بتاؤ سوال کس کا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

افلاطون: یہ سوال میرا ہے اور میری عقل سے آیا ہے۔

ڈاکٹر بقراط: سوال تمھارا ہے چلو مان لیا۔ لیکن جگہ کا پتہ غلط بتا رہے ہو۔ اس پتے پر عقل نام کی کوئی چیز نہیں رہتی۔ رہتی تو...

افلاطون: ٹھیک ہے ٹھیک ہے ...رہتی تو میں ایک ہی کلاس کئی سال سے نہ پڑا رہتا۔ یہی کہنے والے تھے نہ آپ۔ بات دراصل یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ میں زیادہ سے زیادہ تعلیم کے ساتھ تجربہ بھی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ آپ جیسے ایک سال میں ہی ایک کلاس چھوڑ کر آگے بھاگ جانے والوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ کیا جانیں ایک ہی تعلیم کو بار بار حاصل کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ مگر چلیے سوال کا جواب تو دیجیے۔

چوزہ انڈے سے نکلتے ہوئے

ڈاکٹر بقراط: دیکھو بھئی تمھارا سوال انڈے کے بارے میں ہے اور مرغی کا انڈا چونکہ مسز مرغی اور مسٹر مرغ کے بیچ کا گھریلو معاملہ ہے اس لیے ان ہی سے یہ بات پوچھی جانی چاہیے۔ ویسے بھی تم جانتے ہو، ہم کسی کے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دیتے۔

افلاطون: میں جانتا تھا آپ ٹال جائیں گے۔ خیر انڈے پر ایک اور سوال ہے۔ سمن پورہ پٹنہ بہار سے چھٹی جماعت کی رفعت فاطمہ پوچھتی ہیں، انڈے میں دو رنگ کا پانی کیوں ہوتا ہے؟ جواب دیجیے۔

ڈاکٹر بقراط: رفعت بی بی جسے پانی کہہ رہی ہیں اس کے لیے صحیح لفظ ہے سیّال یا رطوبت۔ انڈا عام طور پر چونکہ مرغی کا ہی زیادہ کھایا جاتا ہے اس لیے ہم اسی کی بات کریں گے۔

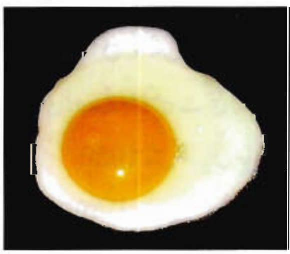

انڈا چار چیزوں سے بنتا ہے۔ ایک اس کا خول دوسری اس کے اندر کی تھوڑی سی ہوا، تیسرے سفیدی اور چوتھے زردی۔ خول جن چیزوں کا بنا ہتا ہے ان میں خاص ہے کیلشیم کاربونیٹ Calcium Carbonate، جس میں بہت مہین سوراخ بھی ہوتے ہیں۔ اندر دو

جھلّیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد انڈے کے چوڑے والے سرے کی طرف تھوڑی سی ہوا ہوتی ہے جو تازہ انڈے میں کافی کم رہتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ بڑھتی جاتی ہے جس سے اندر سفیدی اور زردی سکڑنے لگتی ہے۔ سفیدی کی بھی دو تہیں ہوتی ہیں ایک پتلی اور ایک گاڑھی۔ یہ 90 فیصد پانی سے بنی ہوتی ہے۔ اس میں صرف 10 فیصد وٹامن ہوتا ہے، اور کولیسٹرول یا چکنائی لگ بھگ نہیں کے برابر۔ سفیدی دراصل زردی کے بچاؤ کے لیے ہوتی ہے جو انڈے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ یہ پروٹین اور غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے اور آگے چل کر اسی سے مرغے کے چوزے کا خون اور باقی جسم تیار ہوتا ہے۔ سفیدی کا کچھ حصہ اس کی ہڈیاں بنانے میں لگتا ہے۔ زردی یاYolk کا رنگ مرغی کی غذا کے رنگ پر منحصر ہوتا ہے۔ پیلے مکئی کے دانے یا سورج مکھی کے بیج کھلانے پر مرغی جو انڈا دیتی اس کی زردی گاڑھے پیلے رنگ کی ہوجاتی ہے۔ بے رنگ دانوں والی غذا سے زردی Yolk کا رنگ بھی بے رنگ رہتا ہے۔ لیکن رنگ جیسا بھی ہو yolk کی خصوصیت اور غذائیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میرا خیال ہے اتنا جواب کافی ہے۔

افلاطون: جی ہاں اتنا انڈا بہت ہے۔ رامپور یوپی سے فیض عالم پوچھتے ہیں کہ جلنے اور جلانے والی دو گیسوں سے مل کر بننے والا پانی آگ کو کیسے بجھا دیتا ہے؟

ڈاکٹر بقراط: بہت خوب۔ بڑا دل چسپ سوال کیا ہے فیض میاں۔ بات بالکل سامنے کی ہے مگر اکثر پانی سے آگ بجھنے کی وجہ سے ناواقف ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ پانی یا H_2O آکسیجن Oxygen جو کہ جلانے والی گیس ہے اور خود ہی جلنے والی ہائڈروجن Hydrogen گیس سے مل کر بنتا ہے، مگر آگ بجھانے کے کام میں یہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ ہوتا دراصل یہ ہے جب بھی آپ آگ پر پانی ڈالتے ہیں تو اس سے دو عمل ہوتے ہیں۔ پہلا عمل یہ ہے کہ پانی فوراً بھاپ بننے لگتا ہے اور پانی سے بننے والی بھاپ چونکہ پانی کے مقابلے میں 1700 گنا جگہ گھیرتی ہے اس لیے یہ بھاپ جلنے والی جگہ سے آکسیجن کو دور ہٹا دیتی ہے۔ اب چونکہ آکسیجن کے بغیر کوئی چیز جل نہیں سکتی اس لیے آگ بجھنے لگتی ہے۔ دوسرا اس سے بھی خاص عمل یہ ہوتا ہے کہ آگ جس چیز میں لگی ہے وہ ٹھنڈی ہونے لگتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ بھاپ بننے Vaporisation سے چیزیں اسی طرح ٹھنڈی ہونے لگتی ہیں جس طرح مٹی کے گھڑے کے مہین سوراخوں سے نکل کر بھاپ بن جانے والا پانی اندر کے پانی کو ٹھنڈا کر دیتا۔ کسی بھی جلتی ہوئی چیز کو ٹھنڈا کردیا جائے تو وہ آکسیجن موجود ہونے پر بھی آگ نہیں پکڑتی۔ بس یہ ہے پانی سے آگ بجھنے کا بھید۔ لیکن یہ بھی سمجھ لیجیے کہ زیادہ گرمی پیدا کرنے والی آگ، مثلاً تیل کے کنویں کی بھیانک آگ اور کوئلے کی کھان میں اندر ہی اندر سلگنے والی آگ پانی سے نہیں بجھتی۔ اس آگ میں پانی ڈالنے سے اس میں موجود ہائڈروجن اور آکسیجن کے ایٹم علاحدہ ہوجاتے ہیں جس سے آگ اور بھڑک اٹھتی ہے۔

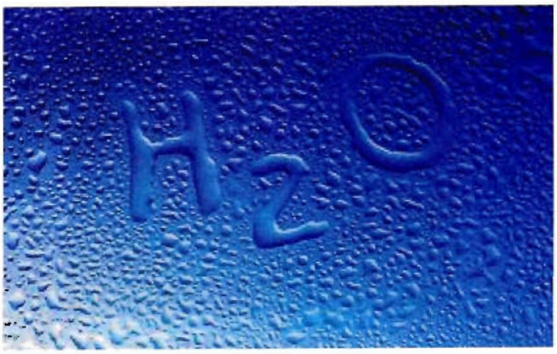

افلاطون: اوفوہ اتنی سامنے کی بات تھی اور میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ اچھا، جھانسی اتر پردیش کے طارق عزیز کو یہ بتائیے کہ زمین کے سب سے نزدیکی ستارے کا نام کیا ہے۔

ڈاکٹر بقراط: بھئی واہ یہ تو اور بھی زیادہ سامنے کا سوال ہے اور جواب اتنا آسان ہے کہ ہوسکتا ہے طارق صاحب اپنے اوپر غصہ ہو جائیں

اتنا سیدھا سا جواب ان کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔خیر پڑھنے لکھنے والوں کے ساتھ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ بہر حال جواب اس سوال کا یہ ہے کہ سورج زمین کا سب سے نزدیکی ستارہ ہے۔زمین سے صرف 14 کروڑ 96 لاکھ کلومیٹر کی اوسط دوری پر۔شائد طارق میاں کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ سورج بھی ایک ستارہ ہے، جس کا اپنے سیاروں Planets کا ایک خاندان ہے اور جو خود اپنی روشنی سے چمکتا ہے۔ جہاں تک اس خاندان کے سب سے نزدیکی ستارے کی بات ہے تو اس کا نام پروکسما سینٹوری Proxima Centauri ہے اور یہ زمین سے 4.243 نوری سال کی دوری پر ہے۔ یعنی اگر ہم روشنی کی رفتار (3 لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) سے خلا میں اڑیں تو چار سال 243 دنوں میں اس تک پہنچ سکتے ہیں۔اس ستارے کا پتہ 1905 میں اسکاٹ لینڈ کے ماہر فلکیات رابرٹ انز Robert Innes نے لگایا تھا۔ بعد میں بہت طاقتور دوربینوں سے اس کے بارے میں معلومات جمع کی گئی۔اس کا نام پروکسما سینٹوری اس لیے رکھا گیا کہ پروکسما لاطینی زبان میں اگلے نزدیکی کو کہتے ہیں اور یہ ہماری نزدیکی کہکشاں سینٹورس Centaurus کا حصہ ہے۔اس عظیم کہکشاں یا گیلیکسی Galaxy کے 281 ستارے اتنے بڑے اور چمک دار ہیں کہ رات کو کسی دوربین کے بغیر بھی نظر آ جاتے ہیں۔مگر پروکسما ایک ٹھنڈا ہوتا ہوا سرخ ستارہ Red Dwarf ہے اور ہمارے سورج کے ساتویں حصے کے برابر ہے اس لیے یہ رات کو بھی کسی طاقتور دوربین کے بغیر دکھائی نہیں دیتا۔ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ اس کا اپنا کوئی سیارہ بھی ہے یا نہیں۔ایک بات اور۔ یہ ستارہ اگلے 33 ہزار برس تک ہی زمین کا قریب ترین ستارہ رہے گا۔اس کے بعد یہ ہم سے دور ہوتا جائے گا اور اس کی جگہ راس 248 Ross لے گا جو اس وقت زمین سے سوا دس نوری سال کے فاصلے پر ہے۔

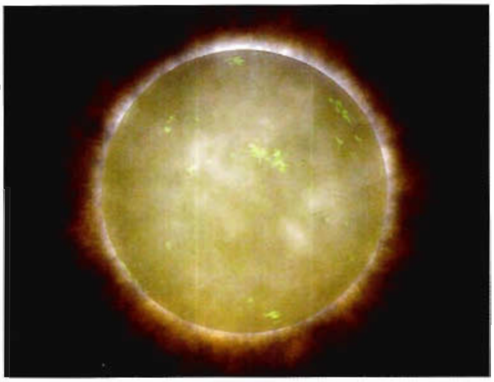

پروکسما سینٹورو کی شبیہ

افلاطون: اوفوہ ڈاکٹر صاحب۔آپ نے تو سامنے کے جواب کو بھی دور کا جواب بنا دیا۔خیر اَب ذرا یہ سوال دیکھیے۔باسط علی اجمیر راجستھان سے سوال کرتے ہیں کہ پہلے سوویت یونین دنیا سب سے لمبا چوڑا ملک ہوا کرتا تھا۔ اب جب کہ سوویت یونین ٹوٹ چکا ہے دنیا کا سب سے بڑا ملک کون سا ہے؟

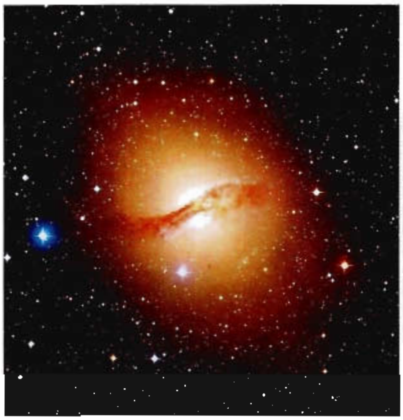

سینٹورس گیلیکسی

ڈاکٹر بقراط: یہ اعزاز اب بھی روس کو ہی حاصل ہے جو پہلے سوویت روس کہلاتا تھا اور سوویت یونین کا سب سے بڑا ملک تھا۔ اس کا رقبہ 17,098,242 مربع کلومیٹر ہے۔ سوویت یونین 1991 میں ٹوٹا تھا۔بس یا اور کچھ؟

افلاطون: بس بس بس۔اور رہنے دیجیے۔اب اجازت لینے کا وقت ہے۔اچھا دوستو۔پھر ملیں گے۔خدا حافظ! □

قلم کاروں سے اہم گزارش

• بچوں کی دنیا کے لیے کچھ بھی لکھتے وقت سادہ زبان اور آسان ترین لفظوں کا استعمال فرمائیں۔• انگریزی لفظوں کو انگریزی میں بھی صاف صاف لکھیں۔• بے وزن و بے بحر شعری تخلیقات نہ بھیجیں۔• کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے شعبۂ ادارت سے ضرور مشورہ کر لیں • ہاتھ سے لکھے مضامین صرف اے فور A4 سائز کے کاغذ پر بھیجیں۔

قسط وار ناول

جولز ورنے • مترجم: صفدر حسین

4 اَسّی دِن کا سفر

فرانسیسی مصنف ، شاعر اور ڈرامہ نویس جولز گیبرئیل ورنے Jules Gabriel Verne دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول نگاروں میں شامل ہیں۔ سائنسی کہانیاں لکھنے میں ان کا جواب نہیں۔ دنیا بھر میں انہیں فادر آف سائنس فکشن کہا جاتا ہے ۔ جاسوسی ناول نگار اگاتھا کرسٹی کے بعد جولز ورنے دنیا کے دوسرے مصنف ہیں جن کی کتابوں کا سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے ۔ ان کے ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں جن میں اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز Around the World in Eighty Day بہت مشہور ہوئی۔ یہ ایک ایسے شریف انسان فلیس فوگ Phileas Fogg کی مہم جوئی کا قصہ ہے جو لندن کے ایک کلب میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کے ایک ایسے زمانے میں صرف اسّی دن کے اندر دنیا کا پورا ایک چکّر لگانے کی شرط قبول کر لیتا ہے جب ہوائی جہاز اور موٹریں نہیں تھیں اور پانی کے جہاز بھاپ سے چلتے تھے۔ جیسے ہی فلیس فوگ اپنے فرانسیسی خادم ژاں پاس پرٹو Jean Passepartout کو ساتھ لے کر شرط کے مطابق اپنا سفر شروع کرتا ہے پولیس اسے ڈاکو سمجھ کر پیچھے لگ جاتی ہے اور یوں طرح طرح کی رکاوٹوں سے بھرا اس کا سفر بالآخر مکمل ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وقت کے معاملے میں پہلی مرتبہ فلیس فوگ سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور وہ بظاہر شرط ہار جاتا ہے ۔ لیکن تبھی ایک حیرت انگیز سچّائی سامنے آتی ہے اور وہ شرط جیت لیتا ہے ۔ قومی اردو کونسل نے اس کتاب کی تلخیص چھاپی ہے جسے ہم سلسلہ وار پیش کررہے ہیں۔ ناول اتنا دل چسپ ہے کہ آپ اگلی قسط کے لیے بے چین ہو اٹھیں گے۔ مدیر

اب تک کی کہانی: یہ کہانی 1872 کی ہے۔ انگلستان کی راجدھانی لندن میں ایک مالدار شخص فلیس فوگ رہتا تھا۔ لوگ بس اتنا جانتے تھے کہ وہ وقت، ضابطوں اور قول کا سخت پابند شریف آدمی ہے۔ وہ ایک بڑے گھر میں تنہا رہتا تھا جہاں اس کا صرف ایک ملازم تھا جسے سارے کام مشین کی طرح قاعدے سے کرنے پڑتے تھے۔ 2 اکتوبر کو بے چارے نوکر کی شامت آئی تو اس نے مالک کو شیو کے لئے روز کی طرح 86 ڈگری کی بجائے 84 ڈگری کا گرم پانی لا کر دے دیا۔ اس پر فوگ نے اسے نکال کر ایک فرانسیسی شخص ژاں پاس پرٹو کو ملازم رکھ لیا جو ایماندار اور وقت کا پابند تھا۔ اسی روز فوگ اپنے 'ریفارم کلب' پہنچا تو اس کے دوست تین روز پہلے 29 ستمبر کو بنک آف انگلینڈ میں پڑی ڈکیتی کے بارے میں بات کرنے لگے، جس میں ڈاکو 55 ہزار پونڈ کے نوٹ لے اڑا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکو نہ جانے کہاں ہوگا اور اتنی بڑی دنیا

میں اسے ڈھونڈ پانا اب ممکن نہیں۔ مگر فوگ کا کہنا تھا کہ انسان کی رفتار نے دنیا کو مختصر کر دیا ہے اور چور کو پکڑا جا سکتا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اسّی روز میں پوری دنیا کا چکّر لگا سکتا ہے۔ اس کے دوست اسٹیوارٹ نے کہا وہ اس پر چار ہزار پونڈ کی شرط لگانے کو تیار ہے۔ دوسرے لوگ بھی شرط میں مل گئے۔ فوگ نے 20 ہزار پونڈ کی شرط قبول کر لی۔ شرط کے مطابق فوگ کو اسی روز 2 اکتوبر بدھ کو سفر پر روانہ ہونا تھا جس کے بعد 21 دسمبر سنیچر کی رات 8 بج کر 45 منٹ تک واپسی پر وہ شرط جیت سکتا تھا۔ فوگ اسی رات اپنے خادم پاس پرٹو کو ساتھ لے کر لندن کے چیرنگ کراسنگ ریلوے اسٹیشن پہنچا اور ڈوور کے بندرگاہی شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر لندن میں اس سفر کی دھوم مچ گئی۔ اخباروں میں خبر کے ساتھ فوگ کی تصویر بھی چھپی۔ ہر طرف اس شرط پر بحث ہونے لگی۔ کئی لوگ فوگ کے حامی تھے تو کئی اس کے دعوے کو غلط مانتے تھے۔ تبھی 9 اکتوبر کو خفیہ پولیس کے جاسوس فکس کا سوئیز شہر سے آیا ہوا ایک ٹیلی گرام اخباروں میں چھپ گیا جس میں اس نے فوگ پر بنک ڈکیتی کا شبہ ظاہر کرتے ہوئے اسے بمبئی میں گرفتار کرنے اجازت مانگی تھی۔ تار سے کھلبلی مچ گئی۔ اکثر لوگوں کو اس پر یقین ہو گیا کیونکہ بنک والوں نے چور کا جو حلیہ بتایا تھا وہ فوگ سے ملتا جلتا تھا۔ اب آگے پڑھیے:

سویز بندرگاہ پر

سات روز بعد 9 اکتوبر بدھ کو دن کے گیارہ بجے فلیس فوگ کا جہاز 'منگولیا' سویز کی بندرگاہ پر پہنچنے والا تھا۔

بندرگاہ سویز دو انگریز، قلیوں، مزدوروں اور مسافروں کے ہجوم میں ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ اس مجمع میں وہ مسافر تھے جو 'منگولیا' جہاز سے بمبئی جانے والے تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو لینے کے لئے بندرگاہ آئے تھے۔ 'منگولیا' جہاز ان دنوں اٹلی کی بندرگاہ برندیسی اور ہندوستان کی بندرگاہ بمبئی کے درمیان چکر لگاتا تھا۔

ان دو انگریزوں میں ایک تو سوئز میں حکومت برطانیہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا اعلیٰ افسر تھا، جو ہر روز جہازوں کی آمد و رفت کے وقت

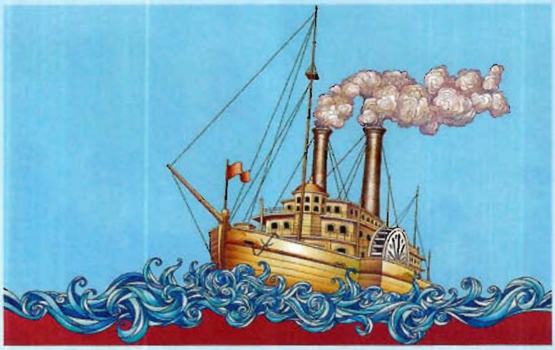

بندرگاہ پر آجاتا تھا کیونکہ اس کا دفتر گودی سے قریب ہی تھا، اور دوسرا شخص سراغ رساں فکس تھا۔ ملک کی ڈکیتی کے بعد ہی چور کو پکڑنے کے لئے ملک سے باہر بھی مختلف بندرگاہوں پر خفیہ کے لوگ بھیجے گئے تھے۔ فکس بھی ان ہی میں سے ایک تھا، جو بینک کے چور کی تلاش کے سلسلہ میں سوئز آیا تھا۔ اگر فکس کسی بھی شخص کو مشتبہ حالت میں پاتا تو اس وقت تک اس کا پیچھا کرتا جب تک اسے گرفتار نہ کرادے۔ دو دن پہلے چور کے حلیہ کی تفصیل فکس کو بھیجی گئی تھی، کیوں کہ پولیس کا یہ خیال تھا کہ شاید چور 'منگولیا' جہاز سے سفر کر رہا ہے۔ اسی لئے فکس 'منگولیا' جہاز کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا اور وہ کئی مرتبہ اپنے انگریز ساتھی سے جہاز کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔

آخر بیزار ہو کر فکس نے دسویں مرتبہ اپنے ساتھی سے پوچھا:

''کیا تمہیں یقین ہے کہ جہاز دیر سے نہیں آئے گا؟''

''جناب وہ بس آتا ہی ہوگا۔ وہ کل رپورٹ سعید کی بندرگاہ پر تھا اور یہ 90 میل کی نہر وہ جلد ہی پار کر لے گا۔''

فکس نے پوچھا: ''کیا 'منگولیا' راستہ میں کہیں رکے بغیر ہی آرہا ہے؟''

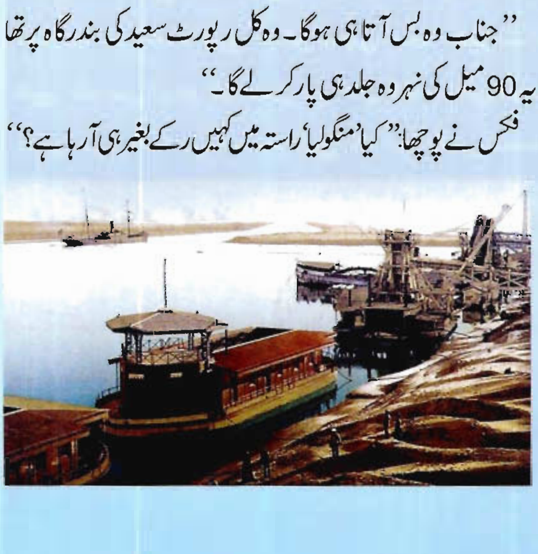

ساتھی نے جواب دیا: ''ہاں! وہ ہندوستانی ڈاک لے کر سنیچر کے دن پانچ بجے شام برندیسی سے روانہ ہوا تھا اور اب اس کے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہوگی، لیکن کیا تم اس شخص کو پہچان بھی سکو گے جس کا حلیہ تمہیں بتایا گیا ہے؟ اگر وہ شخص واقعی اس جہاز پر سفر کر رہا ہے تو پتہ نہیں کیوں، مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ایک ایماندار آدمی ہے۔''

یہ سن کر فکس نے کہا: ''تم ابھی جانتے ہی کیا ہو؟ چوروں کے استاد ہمیشہ شریف آدمیوں جیسے ہی لگتے ہیں اور بس ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہمارے لیے دردِ سر ہو جاتی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سراغ رسانی اب ایک پیشہ نہیں رہا بلکہ ایک فن بن گیا ہے۔''

ساتھی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''تمہارا کام واقعی بہت مشکل ہے پھر بھی میں تمہاری کامیابی کا خواہاں ہوں کیونکہ یہ ایک بہت بڑا ڈاکہ ہے۔''

فکس نے جواب دیا: ''ٹھیک کہا تم نے، بے شک یہ بہت بڑا ڈاکہ ہے جناب! ایک دو نہیں، پچپن ہزار پونڈ اور پھر گرفتاری کا انعام دو ہزار پونڈ۔ اس کے علاوہ چور کے پاس سے جو رقم برآمد ہوگی اس کا پانچ فی صد بھی پکڑنے والے کو ملے گا۔ ایسے مواقع بہت کم ہاتھ آتے ہیں۔ اگر میرا چور 'منگولیا' جہاز پر ہے تو پھر اس کا بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔''

جیسے جیسے جہاز کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا، قلیوں، مزدوروں ملاحوں اور تاجروں کا ہجوم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر بندرگاہ کے گھڑیال نے ساڑھے دس بجائے۔ فکس نے بے چینی سے کہا: ''خدا جانے یہ جہاز کب آئے گا؟ بھلا یہ سوئز پر کتنی دیر ٹھہرے گا۔''

ساتھی نے جواب دیا: ''وہ یہاں کوئلہ لینے کے لئے ٹھہرتا ہے۔ سوئز سے عدن تیرہ سو میل دور ہے۔ اسی لیے جہاز کو کافی مقدار میں کوئلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

کچھ دیر بعد فکس کا ساتھی اپنے دفتر کو چلا گیا۔ اتنے میں سائرن کی آواز سنائی دی۔ دور جہاز نہر کے دونوں کناروں کے بیچ ڈولتا ہوا نظر آیا۔ ٹھیک گیارہ بجے نہر سے نکل کر 'منگولیا' نے سوئز کی بندرگاہ کے پاس سمندر میں لنگر ڈال دیا۔ جہاز میں کافی مسافر تھے۔ کچھ لوگ بیٹھے بیٹھے ہی جہاز سے تماشہ دیکھتے رہے اور کچھ آدمی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں گودی پر آ گئے۔

فکس جہاز سے اترنے والے مسافروں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص قلیوں اور مزدوروں کے مجمع کو چیرتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پاسپورٹ تھا۔ اس نے فکس سے انگریز افسر کے دفتر کا پتہ دریافت کیا۔

فکس جب اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ لے کر غور سے دیکھ رہا تھا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے کیونکہ چور کا جو حلیہ اسے بتایا گیا تھا، پاسپورٹ پر بالکل ویسی ہی تصویر تھی۔

فکس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فوگ کو کیسے گرفتار کرے

فکس نے اجنبی سے پوچھا ''یہ تمہارا تو پاسپورٹ نہیں ہے؟''

''نہیں! یہ میرے مالک کا پاسپورٹ ہے جو جہاز پر ہے۔''

فکس نے اس سے کہا: ''تمہارے آقا کو خود افسر کے پاس جانا پڑے گا تاکہ اس کی شناخت کی جا سکے۔ وہ دیکھو، دفتر کچھ زیادہ دور نہیں ہے؟''

اجنبی نے کہا: ''کیا یہ ضروری ہے۔''

''ہاں بہت ضروری ہے۔''

''پھر تو میں ابھی اپنے آقا کو بلا لاتا ہوں، لیکن وہ جہاز سے اتر کر آنا پسند نہیں کرے گا۔'' پھر اس نے فکس کا شکریہ ادا کیا اور جہاز پر واپس چلا گیا۔ پاس پرٹو کے جاتے ہی، سراغ رساں فکس، انگریز افسر کے دفتر گیا اور اس سے کہا ''جناب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس شخص کی مجھے تلاش تھی وہ 'منگولیا' جہاز پر ہی ہے۔'' اور پھر افسر کو سارا قصہ تفصیل سے سنایا جسے سن کر افسر نے کہا:

''اگر تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی شخص ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہرگز جہاز سے نیچے نہیں اترے گا کیوں کہ کوئی چور کسی جگہ بھی اپنا اتا پتا

نہیں چھوڑتا اور پھر یہ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ اس بندرگاہ پر ہر مسافر اپنے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگوائے۔'' فکس نے جواب دیا:

''لیکن یہ ضرور آئے گا کیوں کہ اس کا پاسپورٹ اصلی ہے اور شاید تمہیں ویزا دینے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

افسر نے کہا: ''لیکن آخر یہ سب کیوں؟ اگر پاسپورٹ اصلی ہے تو میں ویزا دینے سے انکار نہیں کرسکتا۔''

فکس مایوس ہوکر کہنے لگا: ''لیکن جناب، مجھے اس شخص کو ہر حال میں اس وقت تک یہاں روکے رکھنا ہوگا جب تک کہ لندن سے اس کی گرفتاری کا وارنٹ نہ آجائے۔''

افسر نے صاف کہا: ''یہ تمہارا کام ہے۔ میں اپنا فرض پورا کروں گا۔''

اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کو فکس نے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ دیر پہلے اس سے گودی پر مل چکا تھا، اب وہ اپنے مالک کو ساتھ لایا تھا۔ مالک نے اپنا پاسپورٹ انگریز افسر کو دیتے ہوئے کہا: ''اس پر ویزا کی مہر لگادیجئے۔''

پاسپورٹ اس کے ہاتھ سے لے کر افسر نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا۔ فکس کمرے کے ایک کونے سے اس اجنبی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ افسر نے اجنبی سے پوچھا:

''کیا تم فلیس فوگ ہو؟''

''ہاں''

''اور یہ تمہارا ملازم ہے؟''

''ہاں''

''تم لندن سے آئے ہو؟''

''ہاں''

پاس پرٹو نے سیدھے پن میں فکس کو بہت کچھ بتادیا

''اب کہاں جارہے ہو؟''

''بمبئی''

پھر افسر نے کہا: ''تم جانتے ہو کہ تمہارے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں مسافروں کو پاسپورٹ دکھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

فلیس فوگ نے جواب دیا: ''یہ تو میں جانتا ہوں جناب، لیکن ویزا کی مہر دکھلاکر مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں سوئز سے گزر چکا ہوں۔''

افسر نے مطمئن ہوکر پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگائی اور دستخط کر کے تاریخ ڈال دی۔ فلیس فوگ نے فیس دیتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ملازم کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

فکس جواب تک ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا، باہر نکل آیا تو افسر نے اس سے کہا: ''ہاں تو جناب وہ شخص تو مجھے ایک شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

فکس نے جواب دیا: ''شاید ہو! لیکن اب سوال یہ نہیں۔ اب تو تمہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی کہ اس شخص کا ناک نقشہ چور کے حلیہ سے بالکل ملتا جلتا ہے اور میں اس کے ملازم سے اس بات کا اطمینان کرلینا چاہتا ہوں کہ بینک کا اصل چور وہی ہے کیوں کہ مالک سے زیادہ اس کا ملازم کھل کر بات کرتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر وہ پاس پرٹو کی تلاش میں نکل پڑا۔

فلیس فوگ نے گودی پر پہنچ کر پاس پرٹو کو سامان خریدنے کے لئے بازار بھیج دیا اور خود ایک کشتی میں بیٹھ کر 'منگولیا' جہاز پر واپس آگیا۔ پھر وہ اپنے کیبن میں گیا اور اپنی ڈائری میں اس لمحہ تک سفر کی تفصیلات کی جانچ کرلی۔

لندن سے روانگی: بدھ 2 اکتوبر رات 8 بج کر 45 منٹ۔ پیرس آمد: جمعرات 3 اکتوبر صبح 7 بج کر 20 منٹ۔ پیرس سے روانگی: جمعرات صبح 8 بج کر 40 منٹ۔ ٹیورن آمد: جمعہ 4 اکتوبر صبح 6 بج کر

35منٹ۔ ٹیورن سے روانگی: جمعہ صبح 7بج کر 20منٹ۔ برندیسی آمد: سنیچر 5اکتوبر 4 بجے شام۔ منگولیا جہاز سے روانگی: سنیچر 5 بجے شام۔ سوئز آمد: بدھ 9اکتوبر 11 بجے دن۔ کل ½158 گھنٹے یا ½6 دن۔

پھر فلیس فوگ نے یہ ساری تفصیلات ایک بڑے رجسٹر میں لکھ لیں۔ 2اکتوبر سے 21 دسمبر تک ہر روز کے لئے ایک صفحہ مخصوص کیا گیا تھا، جس پر جہاں جہاں وہ گیا اور جب بھی جہاں سے روانہ ہوا، اس کا صحیح وقت لکھتا رہا تاکہ اس سے یہ پتہ چل سکے کہ وہ مقررہ وقت سے کتنے گھنٹے آگے یا پیچھے ہے۔

فلیس فوگ نے اس رجسٹر میں ساری بڑی بڑی جگہوں کے نام لکھے۔ پیرس، برندیسی، سوئز، بمبئی، کلکتہ، سنگاپور، ہانگ کانگ، یوکوہاما، سان فرانسسکو، نیویارک، لیورپول اور لندن۔ اسی رجسٹر میں ہر جگہ کے ٹرین کے اوقات اور جہازوں کی روانگی کے بارے میں ساری معلومات درج تھیں تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ اسّی دن میں ابھی کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ 9اکتوبر بدھ کے دن سوئز پہنچنے پر فلیس فوگ نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ وہ برابر پروگرام کے مطابق سفر کررہا ہے۔ نہ تو دیر ہوئی اور نہ جلدی!

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد بھی فلیس فوگ اپنے کیبن میں بیٹھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ یہاں تک کہ جہاز سے اتر کر اسے سوئز کا شہر دیکھنے تک کا خیال نہ آیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو یہ چاہتے ہیں کہ ملازم اپنے آقا کی جانب سے سیر بھی کریں۔

اُدھر سراغ رساں فکس، پاس پرٹو کو گودی پر اکیلا ہی ٹہلتا دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پوچھا ''اچھا دوست کیا تمہارا کام بن گیا؟''

''ہاں شکریہ۔ لیکن ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ اتنی تیزی سے سفر کررہے ہیں کہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا ہے۔ اچھا بتاؤ کیا یہ واقعی سوئز ہے؟''

فکس نے جواب دیا ''ہاں''

''کیا یہ مصر میں ہے؟''

''ہاں! سوئز مصر میں ہے اور مصر افریقہ میں۔'' فکس نے کہا۔

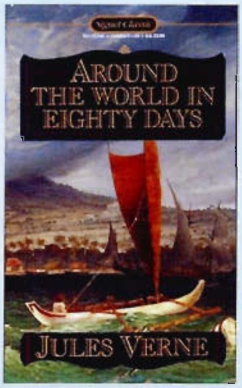

پاپرٹو نے حیرت سے کہا ''افریقہ میں؟ لیکن مجھے یقین نہیں آتا ذرا سوچو تو ہم کتنی دور آگئے ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ہمارا سفر پیرس ہی پر ختم ہوجائے گا۔ میں تو صرف بیس منٹ تک اور وہ بھی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی پیرس کا شہر دیکھ سکا، وہ بھی کیسے، ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن جاتے ہوئے پڑتے پانی میں۔ اور اب ہم سوئز میں ہیں۔''

فکس نے پوچھا، ''آخر تم اتنی جلدی میں کیوں ہو؟''

پاس پرٹو نے جواب دیا مجھے تو نہیں البتہ میرے مالک کو بڑی جلدی ہے۔ ہمیں یہاں کچھ موزے اور قمیض خریدنا ہوگا، کیونکہ ہم تو جلدی میں صرف ایک چھوٹا سا بیگ ہی لے کر چلے تھے۔''

یہ سن کر فکس نے ازراہ ہمدردی کہا ''تم پریشان نہ ہو، میں تمہیں ایک اچھے بازار میں لے جاؤں گا، وہاں تم جو چاہو خرید سکتے ہو۔''

پاس پرٹو نے کہا ''بڑی مہربانی تمہاری۔ لیکن ایک بات کا ہمیں ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ کہیں خرید وفروخت میں جہاز نہ چھوٹ جائے۔''

فکس نے تسلی دی ''جہاز کے روانہ ہونے میں تو ابھی کافی وقت ہے۔ اور ابھی تو صرف بارہ بجے ہیں۔''

پاس پرٹو نے اپنی گھڑی نکالی اور کہا ''بارہ بجے ہیں، ہرگز نہیں، تم مذاق کررہے ہو؟ میری اس گھڑی میں تو دس بجنے میں دس منٹ ہیں۔''

فکس نے کہا ''تمہاری گھڑی سست ہے۔''

پاس پرٹو نے غصہ سے کہا ''کیا کہا؟ میری گھڑی اور سست! یہ تو سال بھر میں پانچ منٹ بھی پیچھے نہیں ہوتی۔ یہ خاندانی گھڑی ہے۔ میرے پردادا کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ یہ ہرگز سست نہیں ہوسکتی۔''

فکس نے چکرا کر کہا ''میں ابھی دیکھتا ہوں کہ آخر قصہ کیا ہے۔ دراصل یہ تمہارا لندن کا وقت ہے جو سوئز کے وقت سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ تمہیں ہر ملک میں دن کے ٹھیک بارہ بجے وہاں کے مقامی وقت سے اپنی گھڑی ملالینی چاہئے۔ تب یہ تمہیں صحیح وقت بتلائے گی۔ سمجھے؟''

پاس پرٹو نے جھنجھلا کر کہا میں تو ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ میری

گھڑی کو کیا ہوا ہے؟''

فکس نے سمجھاتے ہوئے کہا، ''اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو وہ سورج کے ساتھ ساتھ کبھی نہیں چلے گی۔''

پاس پرٹو کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ لیکن وہ کب ہار ماننے والا تھا؟ اس نے گھڑی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ''پھر تو سورج ہی غلط وقت پر نکلتا اور ڈوبتا ہوگا۔ میری گھڑی کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔ یہ تو ہمیشہ بالکل صحیح وقت بتلاتی ہے۔''

فکس نے جب دیکھا کہ پاس پرٹو مطلب کی باتوں سے ہٹتا جارہا ہے تو اس سے پوچھا ''تو تم جلدی میں لندن سے چل پڑے تھے نا؟''

''ہاں ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ پچھلے بدھ کو میرا آقا کلب سے کوئی آٹھ بجے گھر آیا۔ اس سے پہلے شاید ہی وہ کبھی اتنی جلدی گھر آیا ہوگا اور پھر پون گھنٹے ہی میں ہم سفر کے لئے چل پڑے۔''

''لیکن یہ تو بتاؤ آخر تمہارا مالک جا کہاں رہا ہے؟''

''اوہ! وہ تو دنیا کا چکر لگا رہا ہے۔''

فکس نے حیرت سے پوچھا ''کیا وہ پوری دنیا کا سفر کرے گا؟''

''ہاں صرف اسّی دن میں۔ سنو میں تم سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شرط لگی ہے، لیکن مجھے یقین نہیں آتا اس کی بات پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔''

''تمہارا مالک سنکی معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں! بالکل سنکی...''

''کیا وہ بہت مال دار ہے؟''

''ہاں، ہاں بے شک۔ کیوں کہ وہ کافی رقم اپنے ساتھ لے کر چلا ہے اور وہ بھی سارے نئے نوٹ ہیں اور تم جانو، وہ بے حساب خرچ کرتا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں تم مالک کو ایک زمانے سے جانتے ہو گے۔''

''کیوں؟ نہیں نہیں۔ میں اس کے ہاں صرف اسی روز ملازم ہوا جس دن ہم سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔''

یہ ساری گفتگو فکس کے لئے بہت دلچسپ اور کارآمد تھی اور اب

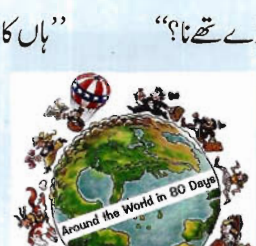

اس کا شبہ یقین میں بدلتا جارہا تھا۔ بلکہ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بینک پر ڈاکہ ڈالنے والا ضرور فلیس فوگ ہی ہے۔ ڈکیتی کے فوراً بعد ہی یوں لندن سے اچانک سفر پر روانہ ہو جانا، اتنی بڑی رقم ساتھ رکھنا اور پھر جلد سے جلد سفر کرنے کی یہ کوشش۔ وہ پاس پرٹو سے کچھ اور بات چیت کر کے فلیس فوگ کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے پاس پرٹو سے معلوم کر ہی لیا کہ فلیس فوگ واقعی بمبئی جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد پاس پرٹو نے فکس سے پوچھا ''کیا بمبئی یہاں سے بہت دور ہے۔''

''ہاں کافی دور ہے۔ 'منگولیا' جہاز کو وہاں پہنچتے پہنچتے دس دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

''اوہ! میرے خدا! اب اور دس دن۔ آخر بمبئی کہاں ہے؟''

''ہندوستان میں۔''

''ایشیا میں؟'' پاس پرٹو نے پوچھا۔ ''خیر ہوگا لیکن ایک بات مجھے بہت پریشان کیے ہوئے ہے۔''

''وہ کیا؟'' فکس نے پوچھا۔

''میں گھر پر بتی بجھانا بھول گیا تھا وہ اب جل رہی ہوگی اور اس کا خرچ مجھے ہی دینا پڑے گا۔ میں نے حساب لگایا کہ ہر چوبیس گھنٹے پر مجھے دو شلنگ کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ یعنی میری روز کی کمائی سے پورے چھ پنس زیادہ۔ اب تم ہی سمجھو کہ جتنا لمبا سفر ہوگا اتنا ہی زیادہ میرا نقصان ہوگا۔''

فکس پاس پرٹو کو بازار میں اکیلا چھوڑ کر انگریز افسر کے دفتر آیا، اور بڑے اطمینان سے کہنے لگا ''میں نے لندن تار دے دیا ہے کہ وہ چور کی گرفتاری کے لئے وارنٹ بمبئی بھیج دیں۔ وہاں میں ان حضرت کو پکڑ لوں گا۔ ایک ہاتھ میں وارنٹ ہوگا اور دوسرا ہاتھ ان ذاتِ شریف کی گردن پر۔''

چار گھنٹے بعد ہی ایک چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لیے فکس بھی 'منگولیا' جہاز پر سوار ہو گیا اور جہاز عدن کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاری

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

کیا آپ کے پاس موبائل فون ہے؟ اگر ہاں تو اس پر اپنے دوستوں اور ممی ڈیڈی کو ایس ایم ایس SMS یعنی شارٹ میسیج / میسیجنگ Short Message/Messaging Service سے پیغام بھی ضرور بھیجتے ہوں گے۔ یہ لفظ SMS ہے تو دراصل ایک سروس لیکن اس کا استعمال اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اسے موبائل پر بھیجے گئے پیغام کا ہم معنی سمجھا جانے لگا۔ خیر ہمیں نام سے کیا، ہمیں تو پیغام سے کام ہے۔ آپ کی طرح ہمیں بھی دوستوں کے ایس ایم ایس ملتے ہیں، اور وہ ایس ایم ایس ہمیں بہت ہی اچھے لگتے ہیں جن میں چٹکلے اور دوسری مزے دار باتیں لکھی گئی ہو۔ ان صفحات پر ہم نے آپ کی دل چسپی کے لیے ایسے ہی مزے دار اردو ایس ایم ایس یہاں وہاں سے اکٹھے کئے ہیں۔ آپ چاہیں تو خود بھی ہمیں ایس ایم ایس کر سکتے ہیں۔ بس تو سوچیے کوئی اچھی سی بات یا لطیفہ، اور اس نمبر پر ہمیں بھیج دیجیے۔ نمبر ہے: 9716145593
آپ کا میسیج مزے دار ہوا تو ہم اسے ان صفحات کا حصہ بنالیں گے۔ لیکن اپنا اور شہر کا نام لکھنا ہرگز نہ بھولیے! مدیر

اگر دم ہے تو اس سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دے کر دکھاؤ
''کیا آپ کو پاگل پن کے دورے پڑنا بند ہو گئے ہیں!''

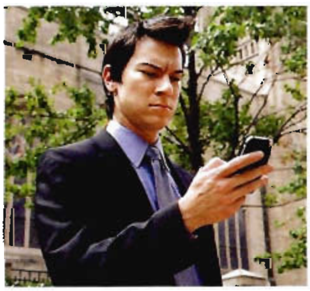

IDE323
IDE 345
LD 1234
PH 1257
IDL129
LOG145
ارے اتنے غور سے کیا پڑھ رہا ہے
آج شام سے پہلے ان سب کاروں پر کپڑا مار دینا

اگر آپ کو لگتا ہے کوئی آپ سے پیار نہیں کرتا
کسی کو آپ کی پروا نہیں ہے
سب آپ کو نظر انداز کر رہے ہیں
تو آپ کو اپنے آپ سے کہنا چاہئے:
بیٹا، تو' ہے ہی اسی لائق!

تو چاند مانگے تو میں چاند دے دوں
تو رات مانگے تو میں رات دے دوں
تو دل مانگے تو دل دے دوں
تو جان مانگے تو...
بس یار
بھیک مانگنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!

تم مسکراتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ انسان
پہلے بندر تھا
دیکھو اب غصہ نہ کرنا ورنہ لگے گا انسان
آج بھی بندر ہے!

ارے او... انڈے کے چھلکے

او...آم کی گٹھلی
سڑے ہوئے بینگن
ابلے ہوئے آلو
مرغی کے چوزے
افریقہ کے بندر
کسی کو ایسا نہ بولو، فیل feel ہوتا ہے یار!

تم مسکراتے رہو
مسکراتے رہو
مسکراتے رہو
مسکراتے رہو
مسکراتے رہو
میرا کیا جاتا ہے
سب تمھیں ہی پاگل کہیں گے

اگر زمین پر ہو تو ایس ایم ایس بھیجو
اگر آسمان پر ہو تو بارش بھیجو
اگر چاند پر ہو تو تارے بھیجو
اگر جنت میں ہو تو دودھ شہد بھیجو
اگر دوزخ میں ہو تو انجوائے یور
سیلف Enjoy your self

مل گیا، مل گیا،
بلّے بلّے
مل ہی گیا
آج تو مل ہی گیا
اس ایم ایس کو پڑھنے کے لیے ایک
اور بے وقوف مل ہی گیا

اے A فار ایپل Apple
بی B فار بڑا ایپل
سی C فار چھوٹا ایپل
ڈی D فار دوسرا ایپل
ای E فار ایک اور ایپل
ایف F فار فری کا ایپل
جی G فار گول ایپل
ایچ H فار ہو گیا نا پیٹ خراب
آئی I فار اتنے سارے ایپل کھا کر!

چین کرکٹ کیوں نہیں کھیلتا؟
کیونکہ ٹیکنیکل پرابلم ہے
اور وہ یہ ہے کہ چین میں
سب کھلاڑیوں کے چہرے ملتے جلتے ہوتے ہیں
جو آؤٹ ہو جائے، وہی منھ دھو کے پھر سے کھیلنے آسکتا ہے!

سنا ہے آپ کی مسکراہٹ پر سب
مرتے ہیں۔
ذرا ٹائم نکال کر آجاؤ۔
ایک چوہا مارنا ہے۔

میں: بھیّا سموسے اچھے نہیں بنے آج۔ کل والے اچھے تھے۔
سموسے والا: کیا بات کرتے ہو بھیّا۔ یہ کل والے ہی تو ہیں۔

ہوسٹل اسٹوڈنٹ: یار دھوکا ہو گیا۔
دوست: کیا دھوکا ہو گیا؟
اسٹوڈنٹ: کیا بتاؤں یار، گھر سے کتابوں کے لیے پیسے منگوائے تھے۔
اور گھر والوں نے کتابیں بھیج دیں! □

شبنم پروین

بیڈمنٹن

لان ٹینس اور ٹیبل ٹینس کے قبیلے کا سب سے پرانا کھیل بیڈ منٹن ہے اور اس کی تاریخ یونان، مصر اور ہندوستان سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ انڈونیشیا، ملیشیا، چین، امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ ہندوستان نے بھی دنیا کو بیڈمنٹن کے مشہور کھلاڑی دیے ہیں۔ چنانچہ جہاں آپ نے ایڈی چونگ (ملیشیا)، ہان جیان (چین)، یانگ یانگ (چین)، ژاؤ زیان ہوا (چین)، روڈی ہارتونو (چین نژاد انڈونیشیا)، آئی سک سگیارتو (انڈونیشیا)، مارٹن فراسٹ (ڈنمارک)، آنگ ایو ہاک (ملیشیا)، ریکسی مینا کی (انڈونیشیا)، پارک جو بونگ (جنوبی کوریا)، محمد مسبن سدیک (ملیشیا)، لم سوی کنگ (انڈونیشیا)، مارٹن ڈیوہیٹنس (ڈنمارک) یا سوسی سوسانتی (چین نژاد انڈونیشیائی)، ڈیوڈ جی فری مین (امریکہ) اور جارج پلازو یلوس (میکسیکو) کے نام سنے ہوں گے وہیں آپ فلم اداکارہ دیپکا پڈوکون کے والد پرکاش پڈوکون، پلیلا گوپی چند، اپرنا پوپٹ کے ناموں سے بھی واقف ہوں گے۔ ایک سید مودی بھی تھے، جنھوں نے اس کھیل میں بڑا نام کمایا لیکن تبھی ان کا قتل ہو گیا۔

بلّے اور پروں والی گیند یعنی شٹل کاک سے کھیلے جانے والے بیڈ منٹن کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ یونان اور مصر میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ اسے بچوں کے ایک کھیل بیٹل ڈور اور شٹل کاک battledore and shuttlecock سے لیا گیا ہے جس میں دو کھلاڑی کارک cork اور پروں سے بنائی گئی ایک 'چڑیا' کو تانت سے بنائے گئے بلّوں سے مارتے تھے۔ یہ کھیل ہندوستان میں بھی کھیلا جاتا تھا اور اٹھارہویں صدی میں اسے پونا Poona کہتے تھے کیونکہ مہاراشٹر کے اسی شہر میں تعینات انگریز فوجیوں نے اس میں دل چسپی لی تھی۔ انھوں نے یہ کھیل دوستوں کو سکھایا اور برطانیہ میں پہلی بار ایک نئے کھیل کی شکل میں یہ 1873 میں ڈیوک آف بیوفورٹ کی طرف سے دی گئی ایک پارٹی میں کھیلا گیا۔ یہ پارٹی ڈیوک نے گلوسسٹر شائر میں اپنے گاؤں بیڈ منٹن میں دی تھی۔ تب اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ لوگ اس کا ذکر 'دی گیم آف بیڈمنٹن' کے طور پر کرتے تھے۔ اسی سے کھیل کا باقاعدہ نام بیڈمنٹن پڑ گیا۔ 1887 تک اس کھیل کو ہندوستانی ضابطوں کے مطابق ہی کھیلا جاتا رہا۔ ان میں کچھ ضابطے انگریزوں کی سمجھ اور منطق سے باہر تھے اس لیے ان میں تبدیلی کی گئی۔ 1893 میں بیڈمنٹن ایسوسی ایشن آف انگلینڈ اس کے ضابطوں کی پہلی کتاب چھاپی تھی۔ 1899 میں

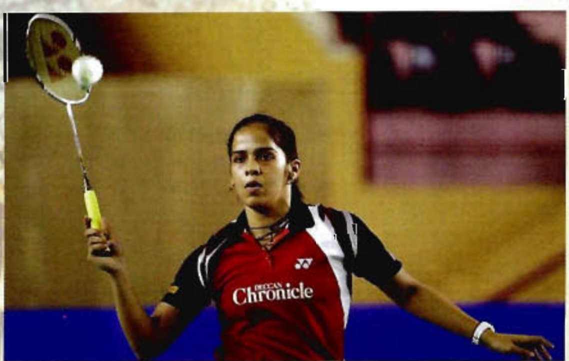

سائنا نیہوال

آل انگلینڈ اوپن بیڈ منٹن چیمپئن شپ شروع کی گئی۔ یہ بیڈمنٹن کا پہلا عالمی مقابلہ تھا۔ 1934 میں کناڈا، ڈنمارک، انگلینڈ، فرانس، ہالینڈ (نیدرلینڈ)، آئر لینڈ، نیوزی لینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز نے انٹرنیشنل بیڈمنٹن فیڈریشن قائم کی جس میں 1936 میں ہندوستان کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اب اس کا نام بیڈ منٹن ورلڈ فیڈریشن ہے اور دنیا بھر میں یہی بیڈمنٹن کو کنٹرول کرتی ہے۔

بیڈ منٹن کورٹ

عجیب بات یہ ہے کہ بیڈمنٹن کو نئی شکل ملی انگلینڈ میں لیکن یوروپ میں اس پر ڈنمارک کا دبدبہ قائم رہا۔ جب کہ عالمی پیمانے پر ایشیائی ملکوں کے کھلاڑی اس پر چھائے رہے۔ انڈونیشیا، جنوبی کوریا، چین، ملیشیا، ہندوستان اور ڈنمارک وہ ملک ہیں جنھوں نے دنیا کو اعلیٰ درجے کے بیڈمنٹن کھلاڑی دیے ہیں۔ حالیہ برسوں میں مرد اور خواتین دونوں کے بیڈمنٹن مقابلوں میں چین ایک بڑی طاقت بن کر ابھرا ہے۔

ٹینس کی طرح بیڈمنٹن کا میدان (کورٹ) بھی چوکور ہوتا ہے جس کے بیچ میں ایک جال لگا رہتا ہے۔ البتہ ڈبلز مقابلوں کا کورٹ سنگلز کورٹ سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ ہر کھیل 21 پوائنٹ کا ہوتا ہے اور ایک ریلی پر ایک پوائنٹ ملتا ہے چاہے سروس کسی کی بھی رہی ہو۔ ہر میچ میں تین گیم ہوتے ہیں اور جو زیادہ گیم جیتتا ہے وہی میچ کا فاتح ہوتا ہے۔ بیڈمنٹن کا بلاّ یا ریکٹ کم وبیش ٹینس کے بلّے جیسا ہی ہوتا ہے۔ گیند کی جگہ اس میں شٹل کاک ہوتی ہے، جسے ہمارے یہاں 'چڑیا' بھی کہتے ہیں۔ سولہ پروں والی اس 'چڑیا' کے پر 'دُم' کی طرف ایک گول کارک سے جڑے رہتے ہیں۔ آج کل پر اور کارک ، نائلون اور پلاسٹک کے بنائے جاتے ہیں چنانچہ یہ شٹل کاک دیر تک چلتے ہیں ورنہ پہلے یہ جلدی جلدی ٹوٹتے رہتے تھے۔

دنیا کے عظیم بیڈمنٹن کھلاڑیوں میں ایک نام چین میں پیدا ہونے اور ملیشیا کی طرف سے کھیلنے والے ایڈی چونگ کا ہے جنھوں نے 1953 سے 1957 تک چار مرتبہ آل انگلینڈ اوپن بیڈ منٹن چیمپئن شپ کے مردوں کے سنگلز کا خطاب حاصل کیا۔ یہ ان دنوں بیڈمنٹن کا اکیلا عالمی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ 1952 اور 1955 میں وہ رنر اپ رہے اور فائنل میں ہی ہارے۔ اسی طرح ڈنمارک کے مارٹن فراسٹ ہیں جو بارہ برس تک عالمی درجہ بندی کے سب سے اوپر کے تین کھلاڑوں میں شامل رہے۔ انھوں نے آل انگلینڈ کے 182, 1984, 1986 اور 1987 کے مقابلے جیتے۔ ملیشیا کے محمد مسبن سدیک نے 1981 میں جرمن اوپن کا پہلا اور 1983 میں دوسرا بین الاقوامی خطاب حاصل کیا۔ 1983 میں ہی انھوں نے سویڈش اوپن کا خطاب جیتا اور گرمن اوپن کے علاوہ کینیڈین اوپن میں بھی فاتح رہے۔ خواتین میں انڈونیشیا کی چینی نژاد کھلاڑی سوسی سوسانتی کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ بیڈمنٹن کی واحد خاتون کھلاڑی ہیں جو ایک ساتھ اولمپک، ورلڈ چیمپئن شپ اور آل انگلینڈ کے خطابات پر ایک ساتھ قابض رہیں۔ انھوں نے جاپان اوپن کا خطاب 3 مرتبہ اور انڈونیشین اوپن کا خطاب 5 مرتبہ حاصل کیا۔

ہندوستانی کھلاڑیوں میں پرکاش پڈوکون کو آپ بیڈمنٹن کا سچن تینڈولکر کہہ سکتے ہیں۔ وہ طویل عرصے تک ہندستانی بیڈمنٹن پر چھائے رہے۔ لگاتار 9 مرتبہ

جوالا گٹا

نیشنل سینیئر خطاب حاصل کرنے کا ریکارڈ بنانے والے پرکاش پڈوکون نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مقابلے جیتے ہیں جن میں آل انگلینڈ اور ڈینش اوپن کے مقابلے شامل ہیں۔ پڈوکون کے جانشین سید مودی نکلے، جن کا اصل نام سید مہدی تھا۔ کیریئر کی شروعات میں ممبئی کے اخبارات نے غلطی سے ان کا نام سید مودی چھاپ دیا تھا۔ لوگ انھیں اسی نام سے پکارنے لگے تو انھوں نے بھی یہی نام اپنا لیا۔ 1980 سے 1987 تک مسلسل 8 مرتبہ نیشنل بیڈمنٹن چیمپئن رہنے کے علاوہ انھوں نے 1982 میں کامن ویلتھ سنگلز خطاب جیتنے کے بعد 1983 اور 1984 میں آسٹرین انٹرنیشنل خطاب جیتا۔

پلیلا گوپی چند

اس سے پہلے کہ وہ اور آگے جاتے 28 جولائی 1988 کو لکھنؤ کے 'کے ڈی سنگھ بابو اسٹیڈیم' میں کھیل کی مشق کے بعد باہر آتے ہی انھیں قتل کر دیا گیا۔ قتل کا الزام بعد میں ان کی بیوی امیتا مودی پر اور ان کے سیاست داں دوست سنجے سنگھ پر لگا، جنھوں نے امیتا سے شادی بھی کی، لیکن الزام ثابت نہیں ہوسکا اور آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ انھیں کس نے قتل کرایا تھا۔

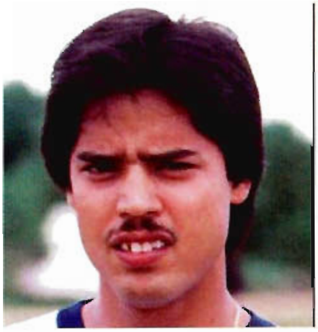

سید مودی

پلیلا گوپی چند ہندوستان کے ایک اور مایہ ناز بیڈمنٹن کھلاڑی ہیں جنھوں نے پرکاش پڈوکون کی سرپرستی میں اپنا کیریئر شروع کیا اور 1989 میں قومی چیمپئن شپ جیتنے کے بعد 2001 میں چین کے چینگ ہو کو ہرا کر آل انگلینڈ خطاب حاصل کیا اور یہ خطاب جیتنے والے وہ دوسرے ہندوستانی تھے۔ ڈبلز مقابلوں میں کیرل کے حسین اسماعیل ہندوستان کے سب سے اچھے بیڈمنٹن کھلاڑیوں میں سے ایک مانے گئے ہیں۔

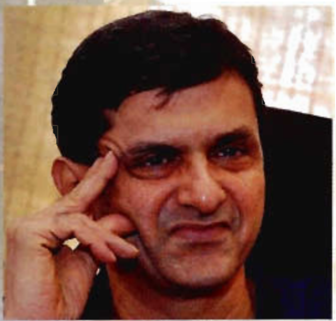

پرکاش پڈوکون

خواتین میں ہندوستان کی اپرنا بالن نے مکسڈ ڈبلز میں ملک کا نام روشن کیا ہے اور 2006 میں قومی خطاب جیتنے کے علاوہ 2008 میں بحرین انٹرنیشنل کے مکسڈ ڈبلز خطاب پر بھی قبضہ کیا۔ ان کے علاوہ مدھومتا بشٹ، جوالا گٹا اور سائنا نیہوال بھی بہترین کھیل کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔ سائنا نیہوال کو لوگ بیڈمنٹن کی ثانیہ کہتے تھے مگر اب وہ ثانیہ سے کافی آگے نکل چکی ہیں۔ وہ اولمپک میں بیڈمنٹن کے کوارٹر فائنل میں پہنچنے والی اب تک کی پہلی ہندوستانی خاتون کھلاڑی ہیں اور عالمی درجہ بندی میں تیسرے نمبر تک پہنچ چکی ہیں۔ ان دنوں ان کے علاوہ آدتی مٹاٹکر، تروپتی مروگنڈے اور سیالی گوکھلے بھی اچھا کھیل رہی ہیں۔ مرد کھلاڑیوں میں چیتن آنند، اروند بھٹ، انوپ سری دھروہ کھلاڑی ہیں جو تیزی سے ابھر رہے ہیں۔ □

♦ شبنم پروین، C280 شاہین باغ جامعہ نگر نئی دہلی۔110025

اس دن آپ نے اس محبت سے کہانی کی فرمائش کی کہ میں اگلی فرصت میں ہی اسے لکھنے بیٹھ گیا۔ تقریباً پینتالیس برسوں کے بعد لکھنے کی کوشش کی ہے، مجھے بالکل پتہ نہیں کہ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ آپ کو پسند نہ آئے تو آپ بلاتکلف اسے ضائع کر سکتے ہیں۔ میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔ البتہ اس کہانی کو لکھتے وقت بار بار یہ محسوس ہوتا رہا کہ بچوں کی کہانی لکھنا بہت مشکل ہے، بڑوں کے لیے افسانہ لکھنا کافی آسان! خدا آپ کے ارادوں میں استحکام دے۔

عبدالصمد، A-212، رجنی گندھا، صداقت آشرم پٹنہ۔ 800010
فون نمبر۔ 0612 2265829

خدا کرے کہ ہندوستان کے بچوں کی دنیا بھی 'بچوں کی دنیا' کے پہلے شمارے کی طرح ہی خوبصورت ہو جائے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو، بچوں کو یہ تحفہ دینے کے لئے مبارکباد کی مستحق ہے۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ دو تین روز پہلے ہی بچوں کے لیے ایک کہانی لکھی تھی 'سورج پاس ہوگیا' یہ آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ آپ کی رائے کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ بچوں کی کتابوں کا اشتہار دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اس میں میری کتاب 'صبح کی پری' کا نام نہیں ہے۔ کونسل نے بہت سال پہلے اسے شائع کیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن تو میں نے چند سال پہلے کتابوں کے میلے میں دیکھا تھا۔ اگر وہ بھی ختم ہو چکا ہو تو کونسل تیسرا ایڈیشن شائع کرنے کے لئے غور کر سکتی ہے۔

رتن سنگھ، اے 402، BETA-I، گریٹر نوئیڈا۔ 201308

کہانی بے حد عمدہ ہے، آئندہ شمارے کے لیے رکھ لی ہے۔ مدیر

'بچوں کی دنیا' کے پہلے شمارے جون 2013، کا نرم و نازک مگر صحت مند و خوبصورت پہلا قدم غریب خانہ کی دہلیز پر قدم رنجہ ہوا۔ شمع کے مانند معصوم سا پرنور مکھڑا صفحہ اول سے کبھی مسکراتا، کہیں کھلکھلاتا، گالوں میں ڈمپل، لباس میں سمپل، کہیں روتا بسورتا، کہیں کہانی سناتا، کہیں کہانی سنتا، کہیں نظموں کی ترنگ، کھیل کود، ذہنی آزمائش سے گزرتا آخری صفحہ 64 پر فیس بک کے شیشہ میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتا ہوا کہ پڑھنے والے کو خود اپنے بچپن کی دل آویز یادوں میں غلطاں کر دے۔ اس دوران ساحر کا گیت ذہن میں دھڑکتا رہا ہے۔ بچے من کے سچے سارے جگ کی آنکھ کے تارے۔ اتنا پیارا پرچہ ارسال کرنے کے لئے بے حد شکر گزار ہوں دست بہ دعا گو ہوں کہ بچوں کا یہ سدا بہار چمن زار دن دوگنی رات چوگنی بہاروں کی پے در پے منزلیں سر کرتا رہے۔ آمین ثمہ آمین۔ 8 سے 88 برس کے تمام بچوں کو عیدالفطر کی اس میٹھی میٹھی مبارکباد کے ساتھ اجازت دیجئے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری، زرینہ منزل، ورنداون کالونی، اولڈ جالنہ ضلع جالنہ، مہاراشٹر۔ 431213

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا پہلا قدم پہلا شمارہ نظر ہوا۔ علم کی شمع روشن کر کے اس کا آغاز بہت اچھا لگا۔ مشمولات نے جی خوش کر دیا۔ بہت وسیع و عریض ملک پر حکومت کرنا آسان ہے مگر پابندی کے ساتھ انتہائی عمدہ اور مرصع و مسجع رسالہ نکالنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ اپنا

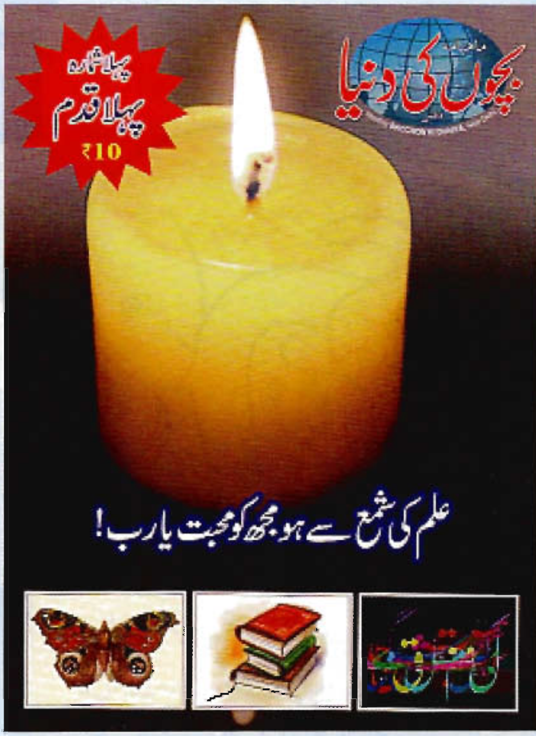

خیال ناقص ہے اتفاق زمانہ مطلوب نہیں۔ محترم اکرام بھائی رسالے کا سائز اور اس کی ترتیب وتہذیب سب کچھ لائق تحسین ہے۔ تمام قلم کارمبارکباد کے قابل ہیں۔ خدا اس 'بچوں کی دنیا' کو لمبی عمر عطا کرے اور اس کے معاونین کا حوصلہ زندہ رکھے۔ آمین۔ عید سے قبل یہ نیا نویلا تحفہ بہت اچھا لگا۔ آپ لوگوں کا اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔

محمد شکیل خاں شکیل سہسرامی،
اردو شعبہ بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ۔ 800015

سلام مسنون، 'بچوں کی دنیا' کا پہلا شمارہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ اردو جاننے والے بچوں کے لیے یہ ایک نہایت خوب صورت سوغات ہے۔ آپ نے 'کھلونا' 'کلیاں' جیسے رسالوں کی یاد دلا دی۔ مجھے یقین ہے بچوں کی دنیا میں یہ رسالہ مقبول ہوگا۔

یٰسین احمد، 17-2-1159/2، واحد کالونی
پوسٹ یاقوت پورہ، حیدراباد، اے پی۔ 500023

'**بچوں کی دنیا**' کا پہلا شمارہ ملا۔ بچوں کے لیے ان دنوں نکلنے والے تمام رسائل میں یہ پرچہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے نمایاں ہے۔ مندرجات میں بچوں کی دلچسپی کے ساتھ ان کی معلومات میں اضافے کے لیے خاصا مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اس شمارے کا سب سے اہم مضمون 'دنیا کے مذہب' ہے، جس کے تحت نصرت ظہیر نے اپنے مضمون (ڈھائی ہزار سال پرانا بودھ دھرم) سے بودھ دھرم یا بودھ فلسفے کا تعارف کرایا ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا تاکہ بچے دنیا کے تمام مذاہب کی اچھی باتوں سے واقف ہوسکیں اور دوسرے مذاہب کی عزت کرنا بھی سیکھیں۔

ڈاکٹر شمشاد حیدر زیدی، 22۔اے/12بی۔
کرامت کی چوکی، الہ آباد۔ 211016

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' پہلا شمارہ پہلا قدم، نظر نواز ہوا۔ سرورق پر شمع کی تصویر 'علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب' اور پشت کے ٹائٹل پر 'گھر بیٹھے اردو سیکھیں' کا اشتہار۔ 'چھوٹی سی اک کتاب میں لاکھوں کا ہے حساب' کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں کامکس، کارٹون، مزے دار کہانیاں، لطیفے، نئی نظمیں، قسط وار ناول، حیرت انگیز چیزوں کا بیان، معلوماتی مضامین، فیس بک، پھر آپ کا اپنا کالم ہے 'آپس کی باتیں' اور اگلے شمارے سے پیچیدہ سوالوں کے جواب دینے کا سلسلہ شروع کرنے کی تیاری۔ 'آپس کی باتیں' بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ اس شمارے میں نصرت ظہیر کا 'ڈھائی ہزار سال پرانا بودھ دھرم' عقیل شاطر کا 'میرا وطن'، گلشن باورا کا 'جیب کترے کی دعا' محمد حسین کا نیک دل درزی، شمیم احمد صدیقی کا 'اپنا امتحان خود لیجیے' پڑھنے میں بڑا مزا آیا۔ مجھے امید ہے ہر دور کے بچے 'بچوں کی دنیا' پسند کریں گے۔ اور کیوں نہیں، خواجہ اکرام الدین کا ہر کام اخلاص سے پر ہوتا ہے۔ کونسل کے جملہ ارکان کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔

معین الدین شمسی، حاجی جمیل احمد روڈ،
بھنڈاری ڈیہہ، گریڈیہہ۔ 815301 □

دماغی ورزش

ذہنی آزمائش

نام ڈھونڈیے:

آج کل کے کچھ مشہور اور اہم ادیبوں کے نام ہم سے حرف بن کر بکھر گئے ہیں۔ کیا تم ان کی ترتیب ٹھیک کر سکتے ہو؟ جواب 'اردو فیس بک' میں

1۔اپ چ درگ گ ن ن ن وی 2۔ااح ررس ش ف ق ل م م ن و ی 3۔اررزگ ل 4۔ااد ض ف ل ن ی 5۔اب رزس ق ل م ن 6۔ب رس ل م ووی ی ے 7۔ب ت ج ح س م ن ئ ے 8۔ح رظ ف ق م ن ی 9۔ااب ت درس ض ع ق ل ی 10۔ب ررزض وی ے

اندر ہاتھی باہر ہاتھی

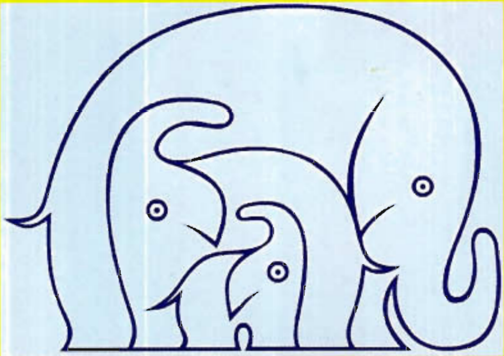

بولو کتنے ہاتھی ؟

▶ میکسیکو کے مصور آکٹیو یو اوکیمپو کی بنائی ہوئی ایک اور عجیب وغریب تصویر جس میں پہاڑوں اور آسمان میں اتنے سارے گھوڑے چھپا دیے گئے ہیں کہ ہم تو گنتے گنتے تھک گئے۔ ذرا تم گن کر دیکھو

اس شمارے کی تصویر

▼ لیجیے لڑائی تو شروع ہوگئی۔ اب مشکل یہ ہے کہ اس الجھی ہوئی لڑائی کو سلجھا کر بند کیسے کرایا جائے۔ صلح کیسے ہو؟ کیا تم بیچ بچاؤ کر سکتے ہو!

آپ کی باتیں

اردو Facebook

پیارے دوستو ، یہ اردو فیس بک یوں تو سب اردو والوں کی ہے لیکن خاص طور پر یہ آپ کے لیے شروع کی گئی ہے۔ جو کچھ آپ اپنے آس پاس اچھا یابرا دیکھتے ہیں،کسی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، کسی سے کوئی دل چسپ بات سنتے ہیں، کوئی لطیفہ یا کوئی معلوماتی بات پڑھتے ہیں ، یا پھر آپ کے گھر میں کوئی دل چسپ واقعہ ہوتا ہے تو اسے ہمارے ساتھ شیئرShare کیجیے۔ہم اسے آپ کی تصویر کے ساتھ چھاپیں گے تاکہ دوسرے بھی آپ کی باتوں کا مزا لے سکیں۔ اچھا یہ ہوگا کہ آپ اپنی بات خود اپنے ہاتھ سے لکھیں۔املے یا جملے کی غلطی سے نہ گھبرائیں ، ہم اسے ٹھیک کر کے ہی چھاپیں گے۔ تو پھر دیر کس بات کی ہے اٹھائیے قلم اور لکھ ڈالیے اپنے دل کی باتیں !اپنے خط کو اسکینScanیا کمپوز کر کے اپنی تازہ ترین تصویر کے ساتھ آپ ہمیں ای میل یا ڈاک سے بھیج سکتے ہیں۔ مدیر

کیا بچّوں کی لکھی چیزیں چھاپیں گے ؟

مدیرانکل میں محمد غلام علی ہوں ، اور کولکاتا کے اسمبلی آف گاڈ چرچ اسکول میں درجہ 6 میں پڑھتا ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' کا پتہ لگا ۔دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہم بچوں کے لیے اتنا اچھا اور پیارا رنگین رسالہ چھاپ رہے ہیں۔کیا اس میں آپ ہم بچوں کی لکھی چیزیں بھی شائع کریں گے؟ ہوسکتا ہے ان میں کچھ کمی رہ جائے لیکن آپ ہیں نا اسے ٹھیک کرنے کے لیے۔

محمد غلام علی125 ، پارک اسٹریٹ کولکاتا۔ 17 ،مغربی بنگال

مجھے پانی میں کھیلنا پسند ہے !

میرا نام ہانیہ خوشنود ہے، میں نے بچوں کی دنیا دیکھی۔ مجھے رسالہ بہت بہت اچھا لگا۔اس میں پیاری پیاری چڑیا ہیں، مزے مزے کی باتیں ہیں، اچھی کہانیاں ہیں اور ہنسنے ہنسانے والی چیزیں بھی ہیں۔ مجھے چاکلیٹ کھانا، کہانیاں سننا اور پانی میں کھیلنا بہت پسند ہے۔ میرے ابو میری شرارتوں سے پریشان رہتے ہیں لیکن وہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔

ہانیہ خوشنود، انٹرنیشنل انڈین اسکول، دمام، کے ایس اے، سعودی عرب

رسالہ بہت خوب صورت ہے

میرا نام حسیبہ بانو ہے۔ایک دن استاد محترم کے ہاتھوں میں 'بچوں کی دنیا' دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ کیا بتاؤں۔رسالہ اتنا خوب صورت ہے کہ مرجھائے ہوئے پھول بھی اسے دیکھ کر پھر سے ہنسنے لگیں گے۔ ہمارے تعلقہ بیلور کے سارے بزرگوں کو اردو سے پیار ہے۔ مجھے بھی اردو اچھی لگتی ہے۔آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو عید مبارک ہو۔

حسیبہ بانو درجہ پانچ ، گورنمنٹ اردو اسکول گنڈے ہلی ، بیلور، ریاست کرناٹک۔ 573101

ہمارے استاد نے رسالہ دکھایا

'بچوں کی دنیا' کا پہلا شمارہ ہمارے استاد جناب رضوان شاہ نے دکھایا تو اتنا اچھا لگا کہ فوراً ان سے لے کر پڑھنے لگی اور اب اپنی ٹوٹی

چھوٹی اردو میں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے غلطیوں کے لیے معاف کریں گے اور ان کی اصلاح کردیں گے۔ میرا نام ثانیہ ہے اور ضلع ہاسن کرناٹک کے تعلقہ بیلور میں ایک چھوٹے سے گاؤں گنڈے ہلی کے سرکاری اسکول میں درجہ چار میں پڑھتی ہوں۔ حسیبہ بانو، میں اور میری سہیلی ارفا سب آپ کو الگ الگ خط لکھ رہی ہیں۔ مجھے بچوں کی دنیا کے اگلے شمارے کا انتظار رہے گا اور سالانہ خریداری کی رقم بھی میرے ابو بھیج رہے ہیں۔

ثانیہ بنت محمد ریاض، گنڈے ہلی پوسٹ، بیلور ضلع ہاسن۔ 573101

گاؤں کے اردو اسکول میں پڑھتی ہوں

پیارے انکل، میرا نام ارفا ہے۔ ہم سب یہاں خیریت سے ہیں۔ ہمارے استاد جناب رضوان شاہ حسین کے پاس 'بچوں کی دنیا' آیا اور مجھے بھی اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں گاؤں کے اردو اسکول میں پڑھتی ہوں اور تیسری جماعت میں ہوں۔ آپ نے بہت اچھا رسالہ نکالا ہے۔ اسے دیکھ کر بچّے اور زیادہ شوق سے اردو پڑھیں گے۔

ارفا بنت محمد علی، گنڈے ہلی پوسٹ، بیلور، ضلع ہاسن کرناٹک۔ 573101

اردو میری مادری زبان ہے

میں احتشام درجہ 6 میں پڑھتا ہوں۔ اردو میری مادری زبان ہے، میں نے اردو کی نظمیں، کہانیاں تو سب پڑھی ہیں، مجھے نظمیں یاد کر کے سنانا اچھا لگتا ہے۔ آپ نے بڑی اچھی میگزین نکالی ہے، اس کی کہانیاں اچھی ہیں۔ مجھے 'رم جھم رم جھم' اور 'چھٹیاں ختم ہوئیں' نظمیں بہت پسند آئیں، 'بچوں کی دنیا' میں اپنے پڑوس کے دوستوں کو بھی پڑھواتا ہوں۔

احتشام، درجہ vi کے آر منگلم (انگریزی میڈیم) اسکول، خلیل اللہ مسجد، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ 110025

اردو کی خاص کلاس ہوتی ہے

میں نے جب سے بچوں کی دنیا کا پہلا شمارہ دیکھا ہے میں اس رسالے کی فین ہوگئی ہوں۔ ہم بچوں کے لیے آپ نے اتنا خوبصورت رسالہ نکالا ہے کہ دل سے واہ واہ نکلتی ہے۔ میرے اسکول میں اردو زبان کی خصوصی کلاس ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے اردو پڑھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی۔ بچوں کی دنیا میں اتنی اچھی تصویریں اور کہانیاں ہیں کہ پڑھ کر مزا آجاتا ہے۔

فوزیہ کہکشاں، کیئر آف صلاح الدین خاں، سساری، گروا، گیا، بہار

بڑے ہو کر ہمیں کیا بننا چاہیے؟

مدیر انکل میرا نام مصباح الدین ہے اور میں آزاد اکیڈمی میں درجہ ششم کا طالب علم ہوں۔ میرے چھوٹے ابو نے مجھے بچوں کی دنیا لا کر دیا۔ اور جب میں نے اسے دیکھنا شروع کیا تو مجھے یہ بہت اچھا لگا۔ ہم بچے گلیوں میں کرکٹ اور کنچے کھیلنے میں کافی وقت برباد کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کھیل بھی ضروری ہیں مگر بس ایک حد تک۔ میرے خیال سے چھٹیوں کے دوران بچوں کی دنیا پڑھنا بھی مزے کی بات ہوگی۔ بچوں کی دنیا میں ایک ایسا کالم بھی شروع کیجیے جسے پڑھ کر ہم یہ طے کرسکیں کہ بڑے ہو کر ہمیں کیا بننا چاہیے تاکہ اس کی طرف ہم ابھی سے دھیان دے سکیں۔

مصباح الدین خاں، کریم گنج، بھدریہ، گیا، بہار

صحیح جواب: نام ڈھونڈیے

1۔ گوپی چند نارنگ 2۔ شمس الرحمان فاروقی 3۔ گلزار 4۔ ندا فاضلی 5۔ سلام بن رزاق 6۔ وسیم بریلوی 7۔ مجتبیٰ حسین 8۔ مظفر حنفی 9۔ قاضی عبدالستار 10۔ زبیر رضوی